انوار نظامیہ
جنکی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخل کہن کو سرنگوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

جمعیۃ الطلبہ جامعہ نظامیہ کا علمی، دینی اور اسلامی رسالہ
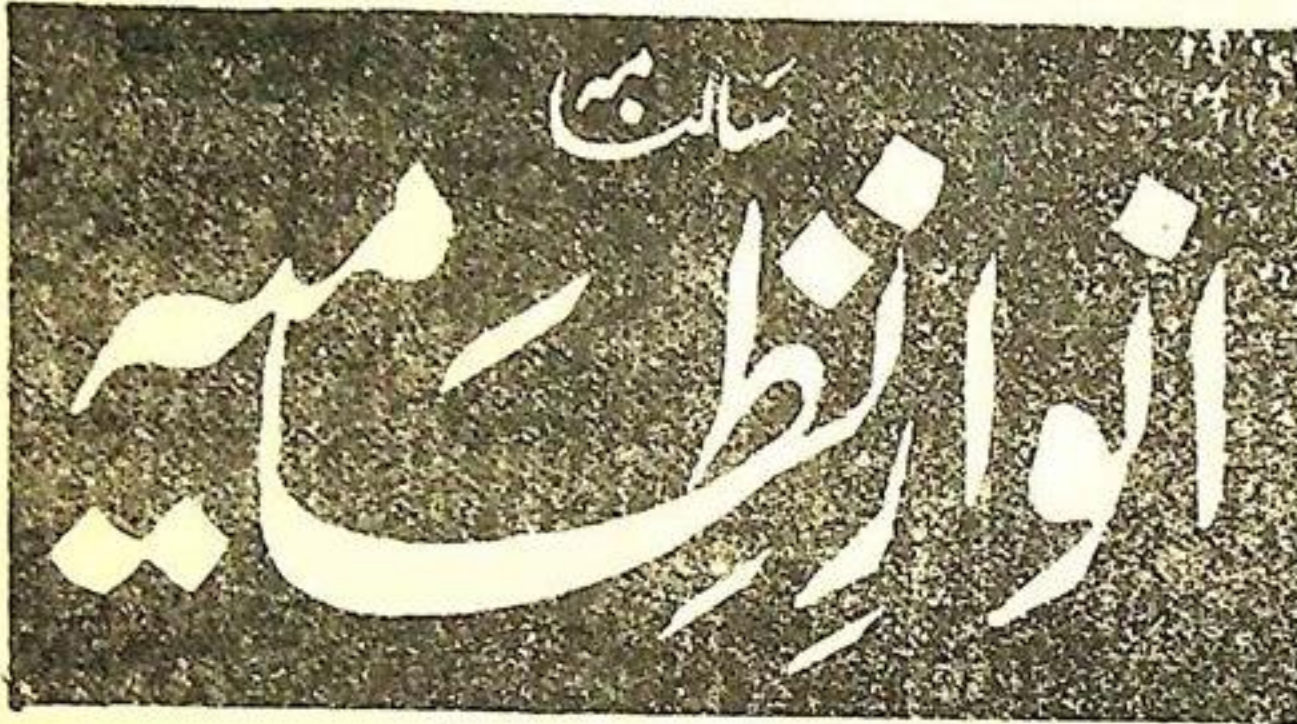
رجب المرجب ۱۳۹۶ھ مطابق جولائی ۱۹۷۶ء

مجلس ادارت

سرپرست مولانا مفتی محمد عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ
جامعہ نظامیہ

مشیر اعلیٰ: مولانا سلطان محی الدین صاحب
(رکن معزز)

مشیر: مولانا خواجہ شریف صاحب
(استاذ جامعہ)

مدیر: حافظ سید محمد عبداللہ قادری کرنولی
(فاضل نظامیہ)

نائب مدیر: مولوی عبدالرحیم بن احمد قرموشی
(فاضل نظامیہ)

انوارِ نظامیہ جمعیۃ الطلباء جامعہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

فون ۲۱۷۴۲

قیمت: ۲/۵۰

تجلیات انوار نظامیہ

ترتیب:

ایم۔اے۔قادری ـــ اے۔آر۔قرموشی

تزئین کار:

محمد جعفر صاحب

مطبوعہ:

رفیق مشین پریس

مالکان:

جمعیۃ الطلبہ

پرنٹر و پبلشر ـــ جمعیۃ الطلبہ جامعہ نظامیہ

مقام اشاعت:

جامعہ نظامیہ شبلی گنج۔حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

ہمارا پیغام

جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
اقبالؒ

الحمد للہ کہ جمعیۃ الطلبہ جامعہ نظامیہ نے اپنی بے بضاعتی و کم مائگی کے باوجود اپنی طاقت و دسترس کی حد تک نیکی و ہدایت کا پیغام بندگان خداوندی تک پہنچانے کیلئے سالانہ "انوار" شائع کرنیکا ارادہ کیا اور آج جمعیۃ کے خادم اس کامیاب جد و جہد پر شکر خداوندی کیا تو سالنامہ انوار بصد مسرت آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں اسکے بعد سہ ماہی یا ششماہی رسالہ شائع کرنے کی کوشش کرینگے الجہد منا والاتمام من اللہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

مسلمانان ہند خصوصاً اہل حیدرآباد سے جمعیۃ الطلبہ کا پہلا پیغام یہ ہے کہ وہ خدا کی رسی یعنی دین اسلام کو مضبوطی سے پکڑیں اور اختلاف جو تمام برائیوں اور زوال کی جڑ ہے اسکو ختم کریں۔

اسلامی تعلیمات کا بغور تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد ہر ذی فہم اس نتیجہ پر پہنچیگا کہ اسلام نظام عالم کو استوار، ہموار، پرامن اور پرسکون بنانے اور انسانیت کو ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچانے کے لئے وحدت اور اتحاد و اتفاق کو ناگزیر قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ساری مخلوق میں اشرف و مشرف بنایا اور شرافت کو باقی رکھنے کے لئے صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں جو دوسری کسی مخلوق میں نہیں وہ فہم و دانش علم و عمل اور دیگر تمام خوبیوں میں سب سے ممتاز ہے ان ہی صفات عالیہ کی وجہ خالق کائنات نے انسان کو نیابت و خلافت کے اعلیٰ و ارفع منصب سے سرفراز کیا ظاہر ہے اس عظیم مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اسکے فرائض بھی بلند و بالا ہوں گے اس لئے انسان کا اولین فرض ہے کہ اللہ کی زمین کو فتنہ و فساد سے پاک رکھے اس کو امن و راحت کا گہوارہ بنانے میں بقدر استطاعت سرگرم عمل ہو جائے نفسانیت اور خود غرضی سے دور رہ کر باہم میل ملاپ اور بھائی چارگی کا ماحول پیدا کرے اعتقادی فروعی اختلاف کو بھلا کر بھلائی کے لئے یکساں اور مساویانہ کاموں میں اپنی صلاحیت کے مطابق حصہ لے ایسا کر کے وہ خلیفۃ اللہ ہونے اور اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کا مستحق ہو گا۔

منفعت ایک ہی اس قوم کا نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات نہ تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اگر اللہ کی زمین پر نفس کی پیروی کرے خود غرض بنکر فتنہ و فساد اور بد امنی کی تخم ریزی کرے تو وہ انسانیت کے اونچے اور اعلیٰ مقام سے گر جائیگا اور اس کا شمار شیاطین کے گروہ میں ہو جائیگا اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصب خلافت کو برقرار رکھنے کیلئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عطا کی ہوئی ذمہ داری کی ادائیگی سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل و منحرف نہ ہو اسی میں فلاح ہے اور یہی نجات کا راستہ ہے

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اللہ تعالےٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا کرے آمین ثم آمین۔

(مدیر اعلیٰ)

ذرا دیکھو انوار کے انوارِ غیبی نہاں کس قدر ہے عیاں کیسے کیسے

درگاہ شریف بانی جامعہ نظامیہ حضرت مولانا انوار اللہ خان فضیلت جنگ علیہ الرحمہ

ارشادات خداوندی

سورہ انعام

بسم اللہ الرحمن الرحیم
قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا
بہ شیئا وبالوالدین احسانا ولا تقتلوا اولادکم
من املاق نحن نرزقکم وایاہم ولا تقربوا الفواحش
ما ظہر منہا وما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا
بالحق ذالکم وصکم بہ لعلکم تعقلون ﴿۱۵۱﴾ ولا تقربوا مال
الیتیم الا بالتی ہی احسن حتی یبلغ اشدہ واوفوا الکیل
والمیزان بالقسط لا نکلف نفسا الا وسعہا واذا
قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی وبعہد
اللہ اوفوا ذالکم وصکم بہ لعلکم
تذکرون ﴿۱۵۲﴾

آیت ۱۵۱-۱۵۲

(اے پیغمبر) کہدیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھکر
سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں وہ یہ کہ اللہ کیساتھ
کسی چیز کو شریک نہ ٹھیراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور
مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو کیونکہ تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے
ہیں اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی مت جاؤ چاہے ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور
جس جان کا قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہ کرو مگر حق کیساتھ ان باتوں
کا تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو ﴿۱۵۱﴾ اور یتیم کے مال کے نزدیک بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقے
سے جو بہت پسندیدہ ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور انصاف
کے ساتھ ناپ تول پورا کرو ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف
نہیں دیتے اور جب کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو اگرچہ کہ تمہارا رشتہ دار
ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو یہ وہ باتیں ہیں جن کا اللہ
نے حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۱۵۲﴾

پارہ ۸ / رکوع ۶

وضاحت

محمد عبداللہ آصفی

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان آیتوں میں چند اصول بیان کیے ہیں جو باہمی معاملات کی درستی کیلئے نہایت ضروری ہیں لیکن عرب نے انکو نظر انداز کر رکھا تھا یہ جملہ (۹) احکامات ہیں چونکہ اسلامی معاشرہ کی بنیاد توحید پر ہے اس لئے سب سے پہلا حکم یہ رکھا کہ (۱) شرک سے پرہیز کرو یعنی ذات و صفات میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک مت ٹھہراؤ اسی کی عبادت کرو (۲) ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو یعنی ان کی تعظیم، اطاعت اور خدمت کرو (۳) عرب میں دستور تھا کہ لڑکیوں کو بھی مار ڈالتے تھے اس لئے حکم دیا گیا کہ مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرو سب کا رازق اللہ تعالیٰ ہے اس نے زمین میں رزق کے خزانے بھر رکھے ہیں انسان کو چاہئے کہ عقل و علم سے ان خزانوں کی کنجیاں تلاش کرے اولاد کو قتل کرنا مفلسی کا بڑا ظالمانہ و جابرانہ علاج ہے جس کی اللہ تعالیٰ اجازت نہیں دیتا (۴) قرآن شرم و حیا کو انسان کا زیور سمجھتا ہے اس لئے حکم دیا کہ بے حیائی کے کاموں کے قریب بھی نہ پھٹکو نہ چھپے ہوئے اور نہ کھلا (۵) معاشرہ کی سلامتی کے پیش نظر قرآن نے انسانی جان کی حفاظت کا انتظام کیا اور حکم دیا کہ کسی انسان کو ناحق قتل مت کرو۔ البتہ حق کے ساتھ یعنی جن حالات میں شریعت نے انسان کا قتل کرنا جائز قرار دیا ہے ان میں کسی انسان کو قتل کر سکتے ہو (۶) اسی طرح یتیم کا مال جو تمہارے قبضہ میں ہے اس کے کبھی قریب نہ جاؤ اور [illegible] ہاں اگر یتیم کی خیر خواہی کی خاطر کچھ تصرف کرنا ضروری سمجھو تو بیشک کر سکتے ہو اور جب یتیم جوان اور ہوشیار ہو جائے تو اس کے حوالہ کردو (۷) مقدور بھر کوشش کرو کہ ناپ تول میں کمی نہ ہو اور لوگوں کا حق نہ مارا جائے (۸) اور جب بات کرو تو سچی اور انصاف کی کرو اور کسی کی رعایت نہ کرو اگرچہ اس میں تمہارے کسی رشتہ دار کا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو (۹) اور احکام الٰہی پر عمل کرنے کا جو عہد کیا ہے اس کو پورا کرو اور اگر کسی بات پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھاؤ یا کوئی منت مانو تو اسکو بھی پورا کرو

• دین سہل و آسان ہے جو شخص دین کو مضبوطی سے پکڑے گا اور شدت کو اختیار کریگا تو ہمیشہ اس پر عمل نہ کر سکیگا اور مغلوب ہو جائے گا لہٰذا میانہ روی اختیار کرو، قرب الٰہی کے چاہنے والے بنو ثواب کی امید رکھو اور آخرت میں مدد چاہو۔

• جب کسی کا اسلام بالکل درست ہو تو جو نیکی وہ کریگا اس کا ثواب دس سے سات سو گنا اضافہ تک لکھا جائے گا باقی جو گناہ کریگا اس کا اتنا ہی لکھا جائے گا جتنا کہ اس نے کیا ہے۔

• جس شخص نے غسل جنابت کی طرح غسل جمعہ کیا اور پھر اول وقت مسجد کو آیا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی نے ایک اونٹ کی قربانی کی اور جو دوسری ساعت میں مسجد کو آیا تو گویا اس نے ایک گائے کی قربانی کی اور اگر تیسری ساعت میں آیا تو گویا اس نے ایک مینڈھے کی قربانی کی اور اگر چوتھی ساعت میں آیا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ایک مرغی کی قربانی دی اور اگر کوئی پانچویں ساعت میں آیا تو اس نے راہِ خدا میں ایک انڈا خیرات کیا، اس کے بعد جب امام خطبہ کے لئے جاتا ہے تو فرشتے یہ فہرست لپیٹ لیتے ہیں اور آ کر خطبہ سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

• اگر میں اپنی امت کی تکلیف کا لحاظ نہ کرتا تو ہر نماز کے ساتھ ان کو مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

• جنت میں ایک دروازہ ہے جس کو ریان کہا جاتا ہے اسی سے قیامت کے دن روزہ دار جنت میں داخل ہونگے اور کوئی اس دروازے سے داخل نہ ہوگا، قیامت کے دن کہا جائیگا کہ روزہ دار کہاں ہیں، روزہ دار یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان کے

علاوہ کوئی آدمی اس دروازے سے داخل نہ ہوگا، جب وہ داخل ہو جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا کوئی دوسرا داخل نہ ہو سکے گا۔

- خدائے تعالیٰ نے تمہارے لئے ماں کی نافرمانی کرنا، کنجوسی کرنا، گداگری کرنا اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا حرام کر دیا ہے اور قیل و قال، کثرت سوال اور بربادیٔ مال کو مکروہ قرار دیا ہے۔
- اگر کوئی شخص کسی کو فاسق یا کافر ہونے کی تہمت لگائے اور وہ واقعۃً ایسا نہ ہو تو اس کا قول اسی پر لوٹ آتا ہے۔
- مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی ہے اور اس کو جان سے مار ڈالنا کفر ہے۔
- قیامت کے دن خدا کے پاس سب سے زیادہ بُرا اس شخص کو پاؤ گے جو ان لوگوں کے پاس ایک منہ لے کر آتا ہے اور دوسروں کے پاس دوسرا منہ لے کر جاتا ہے
- جس شخص کا خدا اور روز قیامت پر ایمان ہو وہ مہمان کی خاطر تواضع کرے ایک دن رات پر تکلف کھانا کھلائے پھر تین دن تک مہمانی ہے اس کے بعد خیرات ہے اور مہمان کے لئے جائز نہیں کہ میزبان کے پاس اتنا قیام کرے کہ اس کو تنگ کر دے۔
- جب چھینکنے والے کو چھینک آئے تو الحمد للہ کہے اور دوسرا آدمی یرحمک اللہ کہے اور جب یہ شخص یرحمک اللہ کہے تو چھینکنے والا یهدیکم اللہ ویصلح بالکم کہے۔
- سوار پیادہ کو سلام کرے اور چلتا آدمی بیٹھے کو سلام کرے اور تھوڑے آدمی بہت سوں کو سلام کریں۔
- اگر تین آدمی ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی باہم سرگوشی نہ کریں۔
- خدا کی قسم میں دن میں خدائے تعالیٰ سے توبہ و استغفار ستر بار سے زیادہ کرتا ہوں۔

"ضرورتِ تقلید" سلسلہ نمبر (۶۸)

کے پیرو ہو کر زندگی گزاری جائے چنانچہ فتح القدیر کی عبارت ہے۔ انعقد الاجماع علی عدم العمل بالمذاهب المخالف من الائمة الاربعة

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ اعلم ان الاخذ بهذه المذاهب الاربعة مصلحة عظيمة وفي الاعراض عنها كل مفسدة كبيرة۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

مولانا مفتی عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ سے ملاقات

عبداللہ کرنولی

جمعیتہ الطلبہ جامعۂ نظامیہ نے اس سال جب سالنامہ انوار کی اجرائی کا ارادہ کیا تو اسی وقت سے میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس رسالہ میں کسی ایک بڑی شخصیت کا انٹرویو بھی شامل ہو جو ایک جدید و مقبول طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے بڑی بڑی مشہور شخصیتوں کے خیالات وافکار جانے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں میری نظرِ انتخاب مولانا مفتی عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ پر پڑی اور میں اپنے نزدیک اس انتخاب کو بہت ہی عمدہ اور مناسب سمجھا، جماعت میں جب ہم درس سے فارغ ہوئے تو میں نے شیخ الجامعہ صاحب سے پوچھا کہ "ہم اپنے رسالہ میں انٹرویو بھی رکھنا چاہتے ہیں" مولانا مسکراتے ہوئے کہنے لگے "اچھی بات ہے کس سے انٹرویو لوگے۔؟" مولانا کی مسکراہٹ سے مجھے اپنی کامیابی پر بے انتہا خوشی اور مسرت ہو رہی تھی، مسرت وکامیابی کے ملے جلے جذبہ سے میں نے کہا یہ انٹرویو آپ ہی سے ہوگا اور جس وقت آپ فرمائیں گے، حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔

مولانا نے فرمایا کسی دوسروں سے انٹرویو لو۔ حیدرآباد میں بڑے بڑے علماء ہیں۔

میں نے کہا چونکہ رسالہ جامعہ کے طلباء سے متعلق ہے لہذا آپ جامعہ کے شیخ ہونے کے ناطے اور آپکا مقام علماء حیدرآباد میں بہت بڑا بھی ہے۔ آپ ہی سے انٹرویو لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

جماعت کے ساتھیوں نے کہا کہ انٹرویو تو شروع ہوگیا ہے۔ دوسرے وقت کی کیا ضرورت۔ مولانا محترم نے بھی سب کی تائید کی۔

اسی وقت انٹرویو کے لیے میں بہت پریشان ہوا اور میرا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا کہ کس قسم کے سوالات ہوں کہیں غلط سوالات وغلط انداز کی وجہ ساتھیوں میں ہجو نہ ہو جائے کیونکہ زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ شکار کرنے کو گئے تھے شکار ہو چلے۔ اسی حیرانی وپریشانی کے عالم میں جامعہ نظامیہ میرے ذہن میں اُبھرا اور میں نے سوال کیا کہ جامعہ کی ترقی عرصۂ پچیس سال سے کیوں رکی ہوئی ہے اسکی ترقی کے لئے آپ کے پاس کوئی نظام العمل ہے یا نہیں اگر ہے تو عمل کیوں نہیں ہو رہا ہے؟

شیخ الجامعہ نے فرمایا: ہمیشہ سے اور بالخصوص موجودہ دَور میں کوئی کام مالی استعانت کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا۔ جامعہ پچیس سال سے مالی بحران کا شکار اس لئے ہے کہ حکومت کی مالی امداد ختم ہوگئی، موجودہ

حکومت غیر مشروط امداد دینا نہیں چاہتی اور قومی تعاون جیسا چاہئے نہیں ہے، کیونکہ قدیم سے یہاں اس کی عادت نہیں رہی حکومت کی سرپرستی میں تمام امور چلتے تھے کئی سال سے پیہم جد و جہد جاری ہے کہ جامعہ کا مالیہ مستحکم ہو جائے مگر حالات کے عدم مساعدت کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہیں ہو رہی ہے پھر بھی اللہ کے بھروسہ پر کوشش جاری ہے اور ذریعہ آمدنی کے لئے جامعہ کی اپنی جائداد کو بنانے کی مہم شروع کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں خادمین جامعہ کا ہم خیال ہونا اور مقصدِ جامعہ کو پیش نظر رکھنا اور اس کے تحفظ کا خیال رکھنا ضروری ہے، چونکہ جامعہ کے تمام امور کی ذمہ داری مجلس انتظامی پر ہے۔ اس لئے اس کی ذمہ داری کسی شخصِ واحد سے نہیں، باقی تعلیمی کام بدستور جاری ہے۔

مولانا کے اس تفصیلی جواب سے میری ڈھارس بندھ گئی تھی۔ ایک لمحہ کو بھی بیکار نہ جانے دیئے بغیر فوراً میں دوسرا سوال کیا۔ جامعہ کے صد سالہ علمی و ملی خدمات کیا کیا ہیں۔؟

مولانا نے فرمایا: جامعہ کے قیام کا مقصد علماء باعمل کو پیدا کرنا اور ان کے ذریعہ علمِ دین کی اشاعت ہے تاکہ عوام موجودہ حالات کی وجہ بے راہ روی کا شکار نہ ہوں یہ مقصد حضرت موسس جامعہ قدس سرہ کی حیات تک بحسن و خوبی انجام پایا اور بانیِ جامعہ کی وفات کے بعد اس وقت تک جاری رہا جب تک حکومت کی سرپرستی رہی نظام حکومت کے دورِ آخر تک ماہانہ پچیس ہزار کی آمدنی تھی جو انقلاب حکومت کے بعد یکلخت مسدود ہو گئی، جس کی وجہ توسیعاتی پروگرام نہ صرف رک گیا بلکہ جامعہ کا وجود معرض خطر میں آ گیا مگر محافظِ حقیقی نے اس کی حفاظت کی جو بفضلہ تعالیٰ محفوظ ہے اس مدت میں متعدد علماء پیدا ہوئے جو صاحب تصنیف و تالیف تھے اور ہر فن میں باکمال تھے، افتاء، طب، درس و تدریس، وعظ و نصیحت وغیرہ، اس وقت بھی جامعہ ہذا میں درس و تدریس کی خدمت فارغین جامعہ ہی سے متعلق ہے۔ جامعہ کی صد سالہ علمی خدمات ان روئیدادوں سے معلوم ہو سکتی ہے جو مطبوعہ ہیں۔

انجمنوں اور جامعات کی ایک عادت سی بنی ہے کہ پچیس، پچاس سالہ اور سو سالہ اپنے زندگی کی بہار پوری ہونے پر عظیم الشان پیمانہ پر سلور جوبلی، گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی کے نام جشن منایا کرتے ہیں۔

جامعہ نظامیہ کے متعلق بھی سنا جا رہا تھا کہ جامعہ اپنا جشن صد سالہ منانے کی کوششوں میں ہے۔ انہی خیالات کو میں نے سوالیہ انداز میں پیش کیا کہ خبر مشہور ہے جامعہ صد سالہ جشن منانے کی فکر میں ہے اس کے لیے کیا پروگرام بنایا گیا ہے اور وہ کب ہوگا۔؟

میرے اس سوال پر مولانا محترم نے پُر امید انداز میں فرمایا: جشن صد سالہ کی تحریک کی گئی ہے، آئندہ سال منایا جائیگا اس کے پروگرام و دیگر انتظامات ایک ذیلی کمیٹی کے سپرد کئے گئے ہیں جو ان کے زیر غور ہیں۔

ایک مرتبہ مولانا سلطان محی الدین صاحب رکن مجلس انتظامی نے بھی فرمایا تھا کہ اس جشن کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے خیال ہے کہ اس جشن میں شاہ خالد کو بھی مدعو کیا جائے جو آئندہ سال جشن دارالعلوم کے موقع پر ہندوستان آرہے ہیں۔

بہت دیر سے حیدرآباد کی موجودہ حالت مسلمانوں کی فرقہ بندی و گروہ بازی کے متعلق میرے ذہن میں یہ سوال آ رہا تھا کہ ان کے اتحاد و اتفاق کے سلسلہ میں مولانا سے پوچھنا

چاہیئے جس میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہے کیونکہ ان کی تمام
فکری صلاحتیں اسی تنازعہ میں صرف ہو رہی ہیں اور ترقی کی
منزل میں حائل ہو رہی ہیں اسی سلسلہ میں مولانا سے یہ سوال کیا
کہ ہندوستان کے مختلف مکاتیب فکر کے علماء اور عمائدین کو
کس طرح متحد کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا اتحاد مفید ہوگا یا
نہیں؛ چونکہ میرا یہ سوال وقت کی اہم ضرورت سے متعلق تھا،
شاید اسی وجہ سے مولانا کے چہرہ پر ایک چمک اور فکری
اثرات مجھے محسوس ہونے لگے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ
مولانا مسلمانوں کی اس طرح تضیع اوقات سے بہت متفکر ہیں۔

انھوں نے اس سلسلہ میں بہت ہی مفید مشورہ دیتے
ہوئے فرمایا: ہندوستان کے مختلف مکاتیب فکر کو صرف کلمۂ
توحید کی بنیاد پر متحد و متفق کیا جا سکتا ہے اور وہ مکاتب فکر
اختلافات کو اپنے تک محدود رکھیں اور اسکو دوسروں پر مسلط
کرنے کی کوشش سے باز آجائیں ورنہ ان کا باہمی اتحاد بہت
دشوار ہے۔ اسی کے ساتھ میں نے ایک عام سوال کیا کہ ہندوستان
کے موجودہ مسلمانوں کی پستی کے اسباب کیا ہیں اور اسکا علاج
کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ میرے اس سوال پر مولانا نے فوراً
کہا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرے سوال کو بھانپ چکے تھے)

فرمایا: ہندوستان کی سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے
مسلمان معاشی پستی میں آگئے جس کی وجہ سے ان کا دینی رخ
کسب معاش کی جانب ہو گیا۔ دین اور علوم دین کی جانب
سے توجہ بے انتہا گھٹ گئی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی حالت
زبوں سے زبوں تر ہو گئی اور خود مسلمانوں میں مختلف العقائد
طبقے پیدا ہو گئے۔ باہم اتحاد و اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے
ان میں انتشار پھیل گیا۔ اس کا واحد علاج ان میں اتحاد و
اتفاق کو اجاگر کرنا اور دینی تعلیم کی تعمیم اور اخلاق اسلامی
سے انکو آراستہ کرنا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس
وقت جس قدر جماعتیں کچھ نہ کچھ کام کر رہی ہے وہ برقرار
رہتے ہوئے ایک مرکزی بڑی جماعت، سیاسی و غیر سیاسی
بنائی جائے جس میں موجودہ ہر تنظیم کے صدور و معتمدین ارکان
ہوں اور تمام اس مرکزی تنظیم سے وابستہ ہوں مرکزی تنظیم
کی ہدایات پر عمل پیرا ہوں تو انشاء اللہ اس کی وجہ سے
مسلمانوں کی ہر طرح اصلاح ہو سکے گی۔

اس تفصیلی جواب کے ساتھ ہی پھر جامعہ نظامیہ میری
نظروں کے سامنے آیا کہ یہ جنوبی ہند کا ایک واحد ادارہ ہے۔
اس طرح کا کام جامعہ نظامیہ سے بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے مولانا سے پوچھا: جامعہ نظامیہ نے اس سلسلہ
میں اب تک کیا رول ادا کیا اور آیندہ کے لیے کیا لائحہ
عمل بنایا گیا ہے۔؟

مولانا نے فرمایا، جامعہ نظامیہ ایک علمی دینی ادارہ
ہے جس کا مقصد اساسی علوم عربیہ کی اشاعت اور انکی حفاظت
ہے اس سلسلہ میں اس کا ماضی نہایت روشن ہے آج ملک
میں علمی مذہبی جو بھی فضا قائم ہے اسی کی وجہ سے ہے لیکن
انقلاب دول کی وجہ جامعہ کی یہ خدمات بھی آگے بڑھنے
سے رک گئی ہیں۔ بانی جامعہ کا حقیقی جانشین تا حال کوئی نہ
ہو سکا جس کی وجہ سے اس کا مقصد جیسا چاہیئے پورا نہ
ہو سکا۔ بریں ہم جامعہ نے اس سلسلہ میں جو خدمات انجام دی
ہیں، انکی سابقہ سالانہ مطبوعہ روئداد سے معلوم کی جا سکتی
ہیں۔ اس کا آئندہ لائحہ عمل وہی مرتب کر سکتے ہیں۔ جن کو اس
جامعہ سے ہر طرح وابستگی رہی ہے۔ مگر وہ اس وقت
منتشر ہیں، اگر وہ ایک جگہ ہو کر اس پر غور کریں تو بہت
کچھ ہو سکتا ہے۔

مولانا کے جواب کے آخری حصہ سے میرے ذہن میں
یہ سوال ابھر آیا جو عام ذہنوں میں متصور ہے کہ جامعہ کو مخلص

حضرات کی ضرورت ہے حقیقتاً یہ ایک چبھتا ہوا سوال تھا پھر بھی میں پوچھ ہی بیٹھا کہ کیا جامعہ کو مخلص حضرات کی ضرورت ہے۔ عام لوگوں کا یہی خیال ہے کہ جامعہ میں کوئی بھی مخلص نہیں ہے کیا یہ حقیقت ہے۔ میرے اس چبھتے ہوئے سوال پر مولانا کسی قسم کا تردد ظاہر کئے بغیر فرمانے لگے جامعہ مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے جس حالت پر قائم ہے اسکے مختلف وجوہ ہیں منجملہ ان وجوہات کے ایک وجہ یہ بھی ایک حد تک درست ہے۔ اب تک کافی وقت گزر گیا تھا مگر انٹرویو میں دلچسپی اور سرگرمی برابر قائم تھی زیادہ وقت لینا نامناسب سمجھتے ہوئے میں نے مولانا سے ایک نجی ذاتی سوال کیا کہ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے آپ متاثر ہو کر اسکو فراموش نہ کرسکے ہوں۔

مولانا نے فرمایا: دورِ حاضر میں ایسے بہت سے واقعات سامنے آرہے ہیں جو ناقابل فراموش ہیں ان میں بعض نہایت حیرت انگیز بھی ہیں اس کی نسبت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

تقریباً انٹرویو ختم ہوگیا تھا، چلتے چلتے یہ خیال آیا کہ قارئین انوار نظامیہ اور طلبا جامعہ کے لئے کوئی پیام لینا چاہیئے۔ اس کیلئے میرا بالکل آخری سوال یہ تھا کہ مولانا آخر میں طلبا جامعہ اور قارئین انوار نظامیہ کے لیے علحدہ علحدہ ایک ہی ایسا پیام دیجئے جس کو مشعل راہ بنا کر جادہ پیمائی کرسکیں۔

مولانا نے فرمایا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معصیتوں کی نسبت دریافت کیا گیا کہ آیا مسلمان زنا کرسکتا ہے، فرمایا ہاں زنا کرسکتا ہے۔ اس طرح ہر گناہ کے متعلق فرمایا کر سکتا ہے۔ آخر میں سوال کیا گیا کہ جھوٹ بول سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ مسلمان جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ آخر زمانہ میں جھوٹ عام ہوجائے گا۔

اس دور میں مسلمانوں کو جھوٹ سے بچنا نہایت ضروری ہے اور سچ کو شعار بنانا لازمی ہے، انجام کار سچائی موجب نجات اور جھوٹ باعث ہلاکت ہے اور اس کے لیے خدا ترسی ناگزیر ہے اور یہ تصور آخرت سے پیدا ہوتی ہے اور سب کا دارومدار علم دین ہے۔ جو اس کو عمل کی نسبت سے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت ہے ہمیشہ نیکی اور بھلائی کی باتوں میں ہاتھ بٹانا ضروری ہے۔ گناہ، ظلم و زیادتی جیسی باتوں سے نہ صرف کنارہ کش رہنا ضروری ہے بلکہ دوسروں کو ممکنہ طریقہ سے روکنا بھی لازم ہے۔ یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے جو اہلِ اسلام کا طرہ امتیاز ہے۔ اس فریضہ کو مسلمان جب تک ادا کرتے رہے سرخرو رہے جب سے یہ فریضہ ترک ہوگیا ہے۔ ذلیل و خوار ہیں، عیاں راچہ بیاں۔

میں انٹرویو کے بعد مولانا کے اجلاس سے یہ شعر گنگناتے ہوئے باہر نکل آیا۔

قائم رہے الٰہی یہ مدرسہ ہمارا
اسلامیت کا مرکز ہے جامعہ ہمارا

نیکی ترے بغیر، نہ ایماں ترے بغیر
اک وہم ہے نجات کا امکاں ترے بغیر
دشوار ہی نہیں یہ امر محال ہے
اللہ کے وجود کا عرفاں ترے بغیر

(ادارہ)

نئے عنصر آتے نہیں چمن میں گل کھلانے کو
یہی ذرّے ابھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے

(اقبال)

اسلام جہاں بہت سی باتوں کا حکم دیتا ہے وہیں اتحاد و اتفاق کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ چنانچہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا والی آیۂ کریمہ اہل اسلام کی توجہ کو اتحاد و اتفاق کی طرف مبذول کراتی آئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کو اتحاد و اتفاق سے ہی راحت حاصل ہوئی ہے۔ اتحاد و اتفاق سے دوستی کی راہیں ہموار ہوئی ہیں، اسلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں جگہ جگہ اتحاد و اتفاق سے رہنے کا حکم صادر فرمایا اور اختلاف پیدا کرنے پر عذاب کی دھمکی دی۔ اور تاریخ بھی یہ بتاتی ہے کہ نفاق سے بڑی بڑی حکومتیں تباہ و برباد ہوتی رہیں اور جب کسی نے اپنے اتحاد کو انتشار میں تبدیل کیا شکست کا منہ دیکھنا پڑا بہرحال اتفاق و اتحاد جیسی بیش بہا نعمت بنی آدم کو اسلام کے سوا کسی اور نے نہیں دیا۔

اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کے ہم شکر گزار ہیں کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں یکجہتی، اتحاد و اتفاق کا عملی نمونہ جمعیۃ الطلباء کی شکل میں عطاء کیا۔ اس حقیقت سے سبھی حضرات اچھی طرح واقف ہیں کہ جمعیۃ الطلباء جامعہ نظامیہ کے زیر اہتمام رسالہ ہذا ملت کے سامنے آیا اسلئے ضروری سمجھا گیا کہ جمعیۃ کا مختصر انداز میں تعارف کروایا جائے۔

یوں تو جامعہ کے ہر دور میں جمعیۃ کی تشکیل ہوتی رہی۔ عہدہ داران و اراکین جمعیت نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کو پروان چڑھانے کی ممکنہ کوشش کرتے رہے، بسا اوقات اس کو آزمائشی دور سے بھی گزرنا پڑا۔ الغرض زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہ بھی ترقی کرتی رہی، خاص طور پر سات سال کی مدت میں اس نے عملی قدم اٹھایا اور کارہائے نمایاں انجام دئے ہمیشہ کی طرح اس سال جمعیت کے انتخابات زیر نگرانی مولانا شیخ الجامعہ صاحب عمل میں آئے۔

جمعیت کا پہلا مقصد:۔

قائم رہے ہمیشہ یہ جامعہ ہمارا

دوسرا مقصد یہ کہ نظامیہ کو بانی علیہ الرحمہ کے مقصد و منشاء کے مطابق چلانے میں تعاون کرنا اور جامعہ نظامیہ کو ایک مثالی جامعہ کی حیثیت سے پیش کرنے میں ہر اعتبار سے آراستہ و پیراستہ کرنا۔

تیسرا مقصد طلباء کے اندر علمی، دینی و اصلاحی تقریری و تحریری صلاحیتیں اجاگر کرنا۔

الحمد للہ اس مقصد عظیم میں جمعیت برابر کام کرتی آرہی ہے اور آئندہ بھی اپنی کدوکاوش کو

جاری رکھے گی اور طلباء کے اندر تحریری وتقریری صلاحیت کو اجاگر کرکے ان ہتھیاروں سے لیس کرے گی جن کی آج کے اس پرفتن ترقی یافتہ دور میں ایک عالم دین کے لئے سخت ضرورت ہے۔ اگر اس سلسلہ میں ہر ایک کا تعاون ساتھ رہا تو وہ دن دور نہیں کہ ہماری کشتی کنارے پر لگ جائے اور انشاء اللہ العزیز وہ دن بھی آئیگا کہ پھر سے بانی علیہ الرحمہ کا دور لوٹ آئے۔

جمعیت کے تحت تین شعبے ہیں۔ بزم ادب، بزم اصلاح، بزم انوار۔

بزم ادب کے تحت ہفتہ واری جلسے ہوتے ہیں اور طلباء کے اندر تقریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنیکی ممکنہ کوشش کیجاتی ہے اور اسی کے تحت ۱۰ مئی کو ایک غیر طرحی نعتیہ مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اور یہ ایک مقدس رات تھی کہ جس میں پچاس سے زائد شعراء نے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں منظوم نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جس میں لوگ کثیر تعداد میں شریک رہے اور اپنی زندگی کے چند لمحات کو سعادت آفرین بنالئے

جلسہ ہائے انعامی مقابلے بسلسلہ یوم امام اعظمؒ منعقد کئے گئے اور ایک عظیم الشان جلسہ یوم امام اعظم ابوحنیفہؒ منعقد کیا گیا جس پر تقریباً چھ سو سے زیادہ رقم خرچ ہوئی۔

بزم اصلاح کے تحت تین عریف مقرر کئے گئے (۱) عریف دار الاقامہ (۲) عریف الصلوٰۃ (۳) عریف المطبخ۔ اور اس سال بزم اصلاح کے تحت چونکہ سیر وتفریح وکھیل کا پروگرام بھی ہوتا ہے

تنگبھدرا ڈیم بذریعہ سروس زیر نگرانی تقدس مآب مولانا محمد سعید صاحب قبلہ شیخ الفقہ بتاریخ ۲۴ر فروری تا ۲۶ر فروری طلباء کو لے جایا گیا۔ جس پر تقریباً اٹھارہ سو روپئے خرچ ہوئے۔

بزم انوار کے تحت طلباء کے اندر تحریری صلاحیتیں پیدا کیجاتی ہیں اور اس پرچہ کا اجراء بھی اسی بزم کے تحت ہوا۔ انشاء اللہ جمعیت ایسے ہی اصلاحی کاوشوں میں کوشاں رہے گی ؎

دور خزاں کا ساز نہ چھیڑے کوئی یہاں
اب نغمۂ بہار سنانے کی بات ہے

عہدہ داران وارکین جمعیت مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ محمد سراج اللہ خان متعلم کامل ۔ صدر جمعیۃ
۲۔ حافظ محمد شبیر الزماں متعلم فاضل ۔ نائب صدر
۳۔ عبدالرحیم بن احمد قرموشی ” فاضل ۔ معتمد
۴۔ حافظ محمد قاسم متعلم فاضل ۔ نائب معتمد
۵۔ حافظ سید محمد عبداللہ قادری متعلم فاضل ۔ خازن
۶۔ محمد خواجہ معین الدین متعلم کامل ۔ رکن معزز
۷۔ محمد مختار احمد متعلم فاضل ۔ رکن معزز
۸۔ سید اکبر حسینی ” ” ۔ رکن معزز
۹۔ محمد جعفر متعلم عالم ۔ رکن معزز
۱۰۔ حافظ محمد قمر الدین متعلم عالم ۔ رکن معزز
۱۱۔ عبدالقوی متعلم مولوی ۔ رکن معزز
۱۲۔ سیف اللہ بیگ ” ۔ رکن معزز

—:—:(✿):—:—

مقتبس :- عبدالرحیم بن احمد قرموشی متعلم فاضل سندی

معارف آگاہ، حقائق دستگاہ العارف باللہ شیخ الاسلام مولانا شاہ انوار اللہ فضیلت جنگ علیہ الرحمہ

بانی جامعہ نظامیہ (اقتباس از انوار احمدی)

وحشت آدم کی گئی نام شہِ لولاک سے
مُردے زندہ ہوگئے تاثیرِ نام پاک سے

روایت ہے کہ ایک قوم حافظ قرآن دوزخ میں داخل ہوگی جس سے بھلا دے گا اللہ تعالیٰ ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا، پھر یاد دلائینگے ان کو جبرئیل علیہ السلام، جب یاد کریں گے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو آگ بجھ جائے گی اور ہٹ جائے گی۔

حضرت انس بن مالک رض سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دو بندے روبرو اللہ تعالیٰ کے کھڑے کئے جائیں گے۔ حکم ہوگا لے جاؤ ان کو جنت کی طرف۔ وہ عرض کریں گے کہ اے رب ہم کس سبب سے قابل جنت ہوئے، حالانکہ کوئی عمل ہم نے ایسا نہیں کیا جس کا بدلہ جنت ہو، ارشاد ہوگا جاؤ جنت میں میں نے قسم کھائی ہے اپنی ذات کی کہ دوزخ میں داخل نہ ہو وہ شخص جس کا نام احمد یا محمد ہو اور نیز فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ نے اپنے عزت وجلال کی قسم کھائی ہے کہ نہ عذاب کرے گا دوزخ میں اس شخص کو جو آپ کے نام کے ساتھ موسوم ہو۔

"مطمئن ہوتے ہیں دل ذکر شہ لولاک سے"

امام سیوطی رح نے درمنشور میں آیۂ شریفہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب کی تفسیر میں نقل کیا ہے اخرج ابن ابی شیبہ وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابوالشیخ عن مجاہد الا بذکر اللہ تطمئن القلوب قال بمحمد و اصحابہ.

ترجمہ :۔ یعنے مجاہد کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ آگاہ رہو کہ اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں، مراد اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابؓ کا ذکر ہے۔ مجاہدؒ نے بذکر اللہ کی تفسیر میں بمحمد و اصحابہ جو کہا ہے ہر چند ظاہر آیتہ شریفہ کے مناسب نہیں معلوم ہوتا مگر چونکہ ایسے مقدس جلیل القدر محدث نے تفسیر کی ہے اس کو بحسن ظن مان لینا چاہئے، کیونکہ ان حضرات کو جب تک کسی معنی کا یقین نہیں ہوتا تفسیر بالرائے نہیں کرتے۔ چنانچہ امام ترمذیؒ نے اپنی جامع کے ابواب تفسیر قرآن میں اس کی تصریح کی ہے

کماقال واما الذی روی عن مجاھد وقتادۃ وغیرھما من اھل العلم انھم فسروا القرآن فلیس الظن بھم انھم قالوا فی القرآن لغیر علم او من قبل انفسھم وقد روی عنھم ما یدل علی ما قلنا انھم لم یقولوا من قبل انفسھم لغیر علم۔

اہل انصاف ضرور یہاں غور فرمائیں کہ امام ترمذیؒ باوجود تجربہ علم و علو شان کے متقدمین کی نسبت کس درجہ کا حسن ظن رکھتے تھے۔ باوجودیکہ تفسیر قرآن کیلئے کمال درجہ کی احتیاط چاہئے تاہم ان کی تفسیر مجرد کو یہ نہ کہا کہ ایسے اقوال بلا استدلال حدیث قابل اعتبار نہیں، بلکہ حسن ظن ظاہر کیا کہ ان حضرات کو ضرور احادیث پہونچی ہونگی گو ہمیں معلوم نہ ہوں۔ جب اس درجہ کے علماء ایسے مواقع احتیاط میں اقوال متقدمین کو صرف بحسن ظن مان لیں تو ہم لوگوں کو متقدمین کی نسبت کس قدر حسن ظن چاہئے کہ نہ ہمیں ویسا علم ہے نہ ویسا فہم۔

افسوس ہے ان لوگوں سے کہ جن کو عبارت پڑھنے کا بھی حوصلہ نہیں ائمہ مجتہدین پر اعتراض کرتے ہیں، اور اگر بالفرض چند کتب حدیث پڑھ بھی لیں تو کیا کہیں امام ترمذیؒ ہو سکتے ہیں؟ حاشا و کلا ترمذیؒ وہ شخص ہیں کہ جن کی جلالت شان و تبحر علم و کمال، قوت حافظہ پر ایک عالم گواہی دے رہا ہے۔ سچ ہے عالی ظرفوں کی بات ہی کچھ اور ہوا کرتی ہے مشہور رہے جیسا آدمی ویسی بات۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

دولۃ الارذال آفۃ الرجال

روایت ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے فرزند شیث علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے فرزند تم میرے بعد میرے خلیفہ ہو پس خلافت کو عمارت تقویٰ اور دستگاہ محکم کے ساتھ لو اور جب یاد کرو تم اللہ تعالےٰ کو تو اس کے متصل نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرو۔ کیونکہ میں نے ان کا نام ساق عرش پر لکھا دیکھا ہے۔ جب میں روح و طین میں تھا پھر تمام آسمانوں میں پھر کر دیکھا کہ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھا نہ ہو۔ میرے رب نے مجھ کو جنت میں رکھا وہاں کوئی محل اور کوئی بالاخانہ اور برآمدہ لیا نہیں دیکھا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہ لکھا ہوا ہو۔ اور سینوں پر تمام حوروں کے ہر جنت کے تمام درختوں اور شجر طوبیٰ اور سدرۃ المنتہیٰ کے پتوں، پردوں کے اطراف، فرشتوں کے

آنکھوں کے بیچ میں نام مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کا لکھا ہوا ہے، اسلئے اکثر ان کا ذکر کیا کرو، فرشتے
قدیم سے ہر وقت ان کا ذکر کیا کرتے ہیں حضرت آدم
علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو جو کثرت
ذکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت فرمائی
اس کا منشاء ایک تو یہ ہے کہ جب فرشتے ہمیشہ
حضرتؐ کا ذکر کیا کرتے ہیں تو ضرور ہے کہ وہ نہایت
عمدہ عبادت ہوگی اور ایسی عبادت زیادہ سے زیادہ
کرنا بہتر ہوگا۔ دوسرا یہ کہ حق تعالیٰ کو آنحضرت صلعم کے
ساتھ جیسی محبت ہے کسی کے ساتھ نہیں، ہر چند
حضرت ابراہیمؑ بھی خلیل اللہ ہیں مگر حبیب اللہ علیہ
الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ محبت کچھ اور ہی ہے۔
چنانچہ خود حضرت خلیل اللہ علیہ السلام معترف ہیں کہ
میری خلت اس درجہ کی نہیں۔ روایت کی مسلم نے
ابوہریرہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے کہ فرمایا رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع کریگا حق تعالیٰ لوگوں کو حشر
میں کھڑے ہونگے ایمان والے یہاں تک کہ قریب ہوگی
ان سے جنت تو وہ آدم علیہ السلام کے پاس آکر کہینگے
اے پدر بزرگوار ہمارے کھلوائیے ہمارے لئے
جنت تو وہ کہیں گے تمھیں جنت سے تمہارے باپ
آدم ہی کی خطا نے تو نکالا ہے میں اس کام کو نہیں
کرسکتا۔ میرے فرزند خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔
ابراہیم علیہ السلام کہیں گے میں بھی اس کام کو نہیں
کرسکتا۔ الغرض آدم علیہ السلام پر یہ امر بخوبی
منکشف ہوگیا تھا کہ حق تعالیٰ کو آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ نہایت محبت ہے کیونکہ ہر ایک
مقام پر نام مبارک کو لکھنا اور فرشتوں سے ہمیشہ
ذکر کروانا فرط محبت پر دلیل قطعی ہے۔ چنانچہ
حدیث شریف میں وارد ہے (من احب شیئا
اکثر من ذکرہ) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے جو شخص کسی چیز کو دوست رکھتا ہے تو
اکثر اس کو یاد کرتا ہے۔ اسلئے حضرت آدم علیہ السلام
نے اپنے اس فرزند کو جو محبوب ترین اولاد اور خلیفہ
تھے وصیت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بکثرت
کیا کریں۔

"مردے زندہ ہوگئے تاثیر نام پاک سے"

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ کسی انصاری کا
انتقال ہوا جو جوان تھے اور ان کی ماں بڑھیا نابینا
تھی۔ ہم نے ان پر کپڑا اڑھایا اور بڑھیا کی تعزیت کی
اس نے پوچھا کیا میرا لڑکا مرگیا ہم نے کہا ہاں، وہ
یہ دعاء کرنے لگی کہ یا اللہ اگر تو جانتا ہے کہ میں نے
تیرے اور تیرے رسول کے طرف ہجرت اس امید پر
کی ہے کہ مدد کرے گا تو ہر سختی میں۔ تو یہ مصیبت
مجھ پر مت ڈال۔ انسؓ کہتے ہیں کہ ہم اپنی جگہ سے
ہٹے نہ تھے کہ اس جوان انصاری نے اپنے منہ سے
کپڑا ہٹایا اور ہمارے ساتھ کھانا کھایا۔ اور
دوسری روایت میں ہے کہ اس وقت تک وہ
زندہ رہے کہ ان کی ماں کا انتقال انکے روبرو ہوا۔
روایت کیا اس کو ابن عدی و ابن ابی الدنیا اور
ابونعیم نے۔ سبحان اللہ کیا قوی ذریعہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا۔ ان بی بی کے دل میں متمکن
تھا کہ بغیر سوچنے کے ویسی نازک حالت میں زبان پر
آگیا۔ اور کیسا اعتقاد کامل تھا کہ شک کو کچھ موقع
ہی نہ ملا۔ خوب ذہن نشین تھا کہ جب سب گھر بار چھوڑ کر

حضرتؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور حضرتؐ کے ہو رہے، تو کیسی مصیبت کیوں نہ ہو جب اس ذریعہ سے دعا کیجائے گی اگر موت بھی ہو تو ٹل جائے گی۔

پھر جب اسی عقیدت کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں وہ دعا پہنچی جس میں نام مبارک حضرتؐ شریک تھا تو اس کا قبول ہونا کیا تعجب کیونکہ ابتدائے نشٔ عنصری انسانی میں یہ سنت اللہ جاری ہو چکی ہے کہ بہ برکت نام مبارک دعا قبول ہوا کرے۔

اب یہاں یہ بحث باقی رہی کہ تاثیر احیا حضرت میں تھی یا بندت میں یا نام آنحضرت صلعم میں یا مجموعہ میں۔ اور اگر مجموعہ میں ہو تو جزو اعظم کون ہے۔ چونکہ یہ بحث مسئلہ تاثیر اذاں کے مشابہ ہے۔ الغرض غور کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ تاثیر نام پاک کی تھی کہ مردہ زندہ ہو گیا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آدم علیہ السلام ہند میں اترے ان کو وحشت ہوئی، اس وقت جبرئیل علیہ السلام اترے اور اذان کہی اس طور سے اللہ اکبر اللہ اکبر دوبار، اشہد ان لا الہ الا اللہ دوبار اشہد ان محمد الرسول اللہ دوبار آخر حدیث تک (مقصود یہ کہ بدولت اس اذان کے وحشت جاتی رہی) اور علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حزیں و غمگین دیکھ کر فرمایا کہ اے ابن ابی طالب تم کو میں غمگین پاتا ہوں، کسی سے کہو کہ تمہارے کان میں اذاں کہدے، وہ غم کی دوا ہے۔ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو آزمایا فی الحقیقت اس سے حزن جاتا رہا اور اس حدیث کے جتنے راوی ہیں سبھوں نے ایسا ہی کہا کہ ہم نے بھی اس کو آزمایا ہے واقعی یہی تاثیر پائی۔

نکتہ:۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب کوئی اپنے محبوب کو یاد کرتا ہے تو جتنے خیالات وحشت انگیز ہوں سب محو ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جب انسان کو کسی کے ساتھ کمال درجہ کی محبت ہو اور اسکو یاد کرے تو دل اسی کے ساتھ متعلق ہو جاتا ہے جس سے خیال ان امور کا جو وحشت انگیز ہوں باقی نہیں رہتا یعنے کیفیت جدیدہ دل میں متمکن ہونے کی وجہ سے کیفیت سابقہ محو ہو جاتی ہے۔

جب یہ تاثیر ہر محبوب کے یاد کرنے میں عموماً ٹھہری تو محبوب رب العالمین کے یاد کرنے میں کس قدر تاثیر ہونا چاہیئے جب بہ حسب عقیدۂ اہل اسلام کسی کیفیت قلبی وغیرہ کا وجود بے تخلیق خالق ممکن نہیں سو جیسے حق تعالےٰ نے ہر محبوب کے یاد کرنے میں تاثیر رکھی ہے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں اگر خاص طور پر وہ تاثیر رکھی ہو تو کیا عجب ہے

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے

لولاك ما خلقت الجنة ولولاك ما خلقت النار اور سلمان فارسیؓ سے

لولاك ما خلقت الدنيا مروی ہے۔

یہاں معلوم کرنا چاہیئے کہ آج کل جو غل مچ رہا ہے کہ لولاك ما خلقت الافلاك حدیث موضوع ہے یہ تسلیم بھی کیا جائے تو اہل جرح کو اس سے فائدہ کیا۔ زمین۔ دریا۔ جنت۔ دوزخ۔ ثواب عقاب جملہ آدمیوں کے جد بزرگوار۔ بلکہ ساری دنیا [٢]

[٢] جب بدولت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئی تو افلاک کیا چیز ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ نظامیہ امیر ملتِ اسلامیہ

الحمد للہ العلی العظیم والصلاۃ والسلام علی من ھو بالمؤمنین رؤف رحیم وعلی
آلہ واصحابہ اجمعین۔

امابعد فقد قال اللہ عزوجل فی کتابہ الحکیم "یوم لاینفع مال ولا بنون الا من
اتی اللہ بقلب سلیم"

اللہ جل شانہ اپنے بندوں کو اس دن کے یاد رکھنے کا
حکم دیتا ہے کہ جس دِن آدمی کو نہ مال نفع دیگا اور نہ اولاد
اس دِن "قلب سلیم" ہی کام آئے گا۔ خاص طور سے مال و
اولاد کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ انسان کو دنیا کی زندگی
میں جب مشکل یا مصیبت کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنا مال خرچ
کرکے جہاں تک ہو سکتا ہے اپنے آپ کو تکلیف سے بچانے
کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات وہ پریشانیوں سے بچ
جاتا ہے اور مال کار آمد ہو جاتا ہے، اور بعض وقت اُس
کی اولاد بھی مصیبت کو دور کرنے میں اوس کے کام آتی
ہے۔ مگر میدانِ قیامت میں ہر شخص کو اپنی نجات کی فکر
ہوگی۔ وہ ایک دوسرے سے بھاگ جائیں گے چنانچہ ارشاد
ہے۔

یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ
وصاحبتہ وبنیہ، (قیامت کے دن) آدمی
اپنے بھائی، ماں باپ، بیوی اور اولاد سے بھاگ جائیگا
یعنی کوئی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ کوئی کسی کا ساتھ دیگا
اس قسم کا مضمون قرآنِ مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، احادیث
صحیحہ میں تو بصراحت آیا ہے کہ انبیاء اولوالعزم تک نفسی نفسی
کہیں گے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دِن فرمائیں گے
"الٰہی میں آج اپنے ہی نفس کی نجات کا سوال کرتا ہوں مریمؑ
جس نے مجھے جنا اوس کے لئے کچھ نہ کہوں گا۔ حضرت آدم علیہ
السلام عرش کا پایہ پکڑے ہوئے عرض کریں گے وہ الٰہی
میری اولاد سے جس طرح تو چاہے کر مگر مجھے اپنے عذاب سے
بچا، اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرے
یوسف پر جو چاہے کر مگر مجھے اپنی حمایت میں لے لے، یہ وہ
دن ہوگا کہ ماں اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائیگی حاملہ عورت

اس دن کی دہشت سے قبل از وقت حمل گرا دیگی اور تمام لوگ اس طرح مدہوش ہوں گے کہ حالت نشہ میں ہیں حالانکہ نہ وقت مستی و نشہ کا نہ ہوگا بلکہ عذاب الٰہی کی شدت کی وجہ سے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے۔ ایسے وقت بتائے کیا عذر پیش کیا جائے گا۔ ہاں! قلب سلیم ہوگا جو کام آئے گا۔ قلب سلیم کی واضح علامت یاد الٰہی سے اطمینان پانا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب خبردار رہو کہ خاص دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں۔ خاص دل وہ ہیں جو ان کی اپنی بیماریوں سے پاک صاف رہتے ہیں۔

دل کی بیماریاں

دل کی بیماریاں حسد ہے یعنی کسی کے مال، جمال، کمال پر جلنا اور ان کے زائل ہو جانے کی آرزو رکھنا، بغض کسی سے دشمنی رکھنا، غیبت، چغلخوری، دروغ بیانی سے نقصان پہونچانے کی کوشش کرنا، خواہشات نفس، نفس جن جن چیزوں کی خواہش کرے اوس کو پورا کرنا خواہ وہ حلال ہوں یا حرام، جائز ہوں یا ناجائز پھر ان میں رضاء الٰہی بالکل پیش نظر نہیں ہوتی۔ جسم بیمار ہو جائے تو فوری اوس کے علاج کی جانب توجہ کیا جاتا ہے اس لئے کہ بیماری کا اثر اعضاء پر ظاہر ہوتا تکلیف اور دکھ محسوس ہوتا ہے اس کے برخلاف دل بیمار ہو تو اوس کا اثر محسوس نہیں ہوتا اس لئے اوس کے علاج کی جانب توجہ نہیں کی جاتی، اصل یہ ہے کہ ہر ایک عضو کو پروردگار نے جس جس کام کے لئے پیدا کیا ہے اگر وہ کام اس سے نہ لیا جائے تو وہ عضو بیکار ہو جاتا ہے مثلاً پاؤں چلنے، ہاتھ پکڑنے، آنکھ دیکھنے کے لئے بنائے گئے اسی طرح دیگر اعضاء کا حال ہے اگر

ان سے اون کا متعلقہ کام نہ لیا جائے تو وہ بیکار ہو جائیگا اور جب ان اعضاء کی قوت زائل ہو جائے تو اس کو بیمار کہا جائے گا۔ اس طرح خالق کائنات نے دل کو بھی ایک کام کے لئے پیدا کیا ہے اور وہ کام حب الٰہی ہے، جس دل میں اللہ کی محبت نہ ہو وہ دل بیمار ہوگا۔ قلب سلیم نہ ہوگا، قیامت کے روز جو دل کام آئے گا وہی دل ہوگا جو اوس کی محبت و معرفت سے لبریز ہوگا۔ اور یہی قلب، قلب سلیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موت کے سوا ہر بیماری کی دوا پیدا کی ہے (لکل داء دواء) ایک روز آنحضور سرا پا نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے اسی طرح دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں صحابہ نے عرض کیا وما جلاءھا زنگ کو دور کس طرح کیا جائے گا۔ ارشاد ہوا تلاوۃ القرآن وذکر اللہ قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر الٰہی۔ کہ ان سے قلب کا اطمینان حاصل ہوتا ہے اور بموجب ارشاد نبوی من احب شیئاً اکثر ذکرہ۔ یعنی جو کسی کو دوست رکھتا ہے تو اس کی یاد بھی زیادہ کرتا ہے۔ مومن کا وصف خاص حب الٰہی ہے جیسا کہ ارشاد ہے والذین آمنوا اشد حبا للّٰہ۔ جو ایماندار ہیں ان کو سب سے بڑھکر خدا کی محبت ہوتی ہے۔ اور ایسے ایمانداروں کو دین اور دنیوی مشاغل یاد الٰہی سے غافل نہیں رکھتے۔ اور کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے بھی ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے، جاگتے ہر وقت یاد الٰہی میں رہنا ابتداء میں مشکل معلوم ہوتی ہے مگر جب کچھ عرصہ تک انسان اپنے دل سے خدا کا ذکر کرتا ہے تو شدہ شدہ دل ایسا خوگر ہو جاتا ہے کہ کسی وقت بھی یاد حق سے غافل نہیں ہوتا ہر وقت خدا کی یاد میں محو رہتا ہے اور اوس میں لذت پاتا ہے بدون ذکر چین نہیں پاتا اللہ کے

دوستوں نے جو کچھ پایا وہ اسی وظیفہ کی بدولت پایا۔ جو لوگ یادِ الٰہی سے محروم و غافل رہتے ہیں، معبودِ حقیقی کو بھول جاتے ہیں تو اللہ جل شانہ بھی ان کو ان کے نفس کی نجات دلانے والی باتوں سے بے خبر کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے وہ دنیا میں طرح طرح کی رسوائیوں، خرابیوں اور ذلتوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی ان پر وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ نفسِ مطمئنہ اور اطمینانِ قلب ان سے کوسوں دور ہو جاتا ہے اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حقیقی آرام اور راحت صرف انھیں کو نصیب ہوتی ہے جو قلبِ سلیم رکھتے ہیں۔

اس بات سے ہرگز دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ بہت سے کاروباری لوگ عیش و آرام، مال و دولت سے سرفراز پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا مالک ان سے راضی ہے بلکہ ان کی دنیوی کوشش اور مال و دولت کے ارادۂ حصول کا نتیجہ ہے اور یہ نتیجہ عام ہے مسلم ہو یا غیر مسلم من یرد ثواب الدنیا نؤتہ منہا۔ یعنی جو بھی چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی محنت کا پھل ملے تو مل جاتا ہے، اور یہ اسی عام قاعدہ کے تحت ہے۔ لیکن یہ زندگی کامیاب زندگی نہیں ہے، کامیاب زندگی ان ہی لوگوں کو میسر ہوتی ہے جن کے دل صحت یاب ہوں۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ بہت سے لوگ جنھیں دنیوی ثروت، امارت، ریاست جاہ و جلال حاصل ہے اور ہر طرح کا آرام اور اس کے سامان مہیا ہیں۔ یادِ الٰہی سے غافل ہیں اور یہ اس کا طبعی تقاضا بھی ہے۔ ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ انسان جب خود کو غنی پاتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو معرفتِ الٰہی نصیب نہیں، اطمینانِ قلب حاصل نہیں، ان کو احکامِ الٰہی، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دیگر عباداتِ اسلامی سے نفرت ہوتی ہے اس لئے بجائے اخلاقِ فاضلہ کے بزدلی، کم ہمتی ان کا شعار بن جاتی ہے۔ اور باوجود غنا و تونگری کے حاجتیں بڑھ جاتی ہیں آن را کہ غنی تر اند محتاج تر اند امورِ دنیوی میں رات دن منہمک رہتے ہیں اگر ان کے کاروبار، لین دین، مال و دولت پر آفت آ جائے تو دل ٹوٹنے لگتا ہے کیونکہ ان کا دل محفوظ و تندرست نہیں۔ ان کے برخلاف ایک فقیر و محتاج جو مشکل سے محنت و مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے اور رات دن یادِ الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ خدائے تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہے وہ ذکرِ الٰہی کی برکت سے قلبِ سلیم پا لیتا ہے وہ زندگی میں اور مرنے کے وقت خوش و خرم رہتا ہے اور مرنے کے وقت اس کے کو شر میں یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کا مژدہ جانفزا سنائی دیتا ہے یعنی اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف چل تو اس سے راضی۔ وہ تجھ سے راضی ہے ہمارے نیک بندوں میں شامل اور ہماری جنت میں داخل ہو جا۔ اسی لئے کہا گیا ہے ـــــ

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا میں جو خاکسار ہیں ان کو حقارت سے مت دیکھ۔ تجھے کیا معلوم اس خاکدانِ عالم میں کوئی سوار بھی ہے۔

ذاکر یا طالب مولیٰ جب اپنے دل کو ذکرِ الٰہی میں لگا دیتا ہے تو اس کے ہر عضو سے ذکر جاری ہو جاتا ہے اس کا ہر عضو مرضئ الٰہی کا تابع ہو جاتا ہے۔ اور بموجب حدیث قربِ نوافل بندہ اس درجہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے کہ خدائے قدوس فرماتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ، کان، آنکھ بن جاتا ہوں

یعنی کلیۃً میری مرضی کے تابع ہو جاتا ہے اس کے اعضا
وہی کام کرتے ہیں جو خدا کو پسندیدہ ہوں لیکن اس کیفیت
پیدا ہونے کے لئے اولین شرط صالحین کی صحبت و تربیت
ہے۔ ارشادِ الٰہی کونوا مع الصادقین (سچے راست بازوں
کی معیت میں رہو) اور ایسے باخدا و عبادت گزاروں کا
اللہ کو اس قدر پاس و لحاظ ہے کہ کبھی وہ کسی کام کے ہونے کی
قسم کھا لیتے ہیں تو اللہ اس کو پورا کر دیتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے
رب اشعث اغبر لو اقسم علی اللہ لابرہ
بعض گرد آلود پراگندہ حال اگر کسی کام کے لئے اللہ کی قسم کھا کر
کہیں گے فلاں کام ہو۔ تو اللہ وہ کام پورا کر کے ان کی
قسم صادق کر دیتا ہے۔ صحابہ کرام کو تمام امت پر فضیلت
کا مدار آنحضور سراپا نور کی صحبت بابرکت اور آپ کی
تربیت و تزکیہ ہے کہ بڑے سے بڑا قطب و غوث، صحابی کے
مرتبہ کو پہونچ نہیں سکتا۔ اسی لئے آنحضور نے نہایت شد و مد
کے ساتھ امت کو آگاہ فرمایا کہ اللہ اللہ فی اصحابی
لا تتخذوا من بعدی غرضا۔ میرے اصحاب کے
بارے میں اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو اور میرے بعد ان
کو نشانِ ملامت نہ بناؤ اور فرمایا کہ اگر تم کوہ احد کے برابر
راہِ خدا میں سیم و زر صدقہ کرو تو صحابہ کے تھوڑے سے خرچ
کے برابر بھی نہ ہوگا۔ لہذا معلوم ہوا کہ عبد صالح کی صحبت و
تربیت قلبِ مومن کو فاسد خیالات اور گندہ وسوسوں سے
پاک و صاف کرنے کے لئے ناگزیر ہے، اور ایسا عبد صالح ہی
اہل اللہ کہلاتا ہے جس کو دیکھ کر بموجب ارشاد نبوی
کی یاد دل میں موجزن ہو۔ جو شریعت کا حد درجہ پابند
ہوتا ہے اوس کی صحبت میں سوائے ذکر خیر اور قرب الٰہی
کے اسباب کے سوا دنیوی کوئی تذکرہ نہیں ہوتا ان

کی صحبت کا یہ فیض ہے کہ ہر قسم ہم نشینی بدبختی سے نکال دیتی ہے
ارشاد ہے لا یشقی جلیسھم، ان کا ہم نشیں بدبخت
نہ ہوگا۔ ایسے اہل اللہ دورِ حاضر میں کم ہو گئے ہیں کم نہیں ہو
آج کل ایسے لوگ خود کو اہل اللہ کا جانشین بتاتے ہیں جو لوگوں
کی خواہش کے مطابق ذکر و فکر عبادت و بندگی کی بجائے صرف
چرب زبانی سے موعظت کے دریا بہانے کے ادعا سے ان سے
یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان "حقائق" کو سمجھ لو تو فلاح ہی فلاح بلکہ
فنا و بقا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ چرب زبانی
دکانداری کو چالاکی اور رانہاد ہوشیاری سے چلاتا ہے اور
بس۔ قرآن حکیم تو صاف صاف حکم دیتا ہے اذکروا اللہ
ذکرا کثیرا۔ اللہ کو کثرت سے یاد کرو وسبحوہ بکرۃ و
اصیلا۔ صبح و شام رب کی تسبیح کرتے رہو، اور ایسے
ذاکرین کی اللہ جل شانہ نے توصیف فرمائی ہے۔ لہذا آج جس
کو شیخ کامل سمجھا جاتا ہے وہ شیخ ناقص بھی نہیں ہے کاش تو
بڑی بات ہے ایسوں کی صحبت نہایت خطرناک ہوتی ہے
عام طور پر مریدوں میں اسی قسم کے لوگ ملتے ہیں جو طالبِ صادق
کی استعداد کو بگاڑ دیتے ہیں مگر چونکہ لوگ سہولت پسند ہو گئے
ہیں ان ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اپنے
اغراضِ نفسانی اور مفادِ شخصی کو اس رنگ میں پورا کرتے
ہیں، ادھر ادھر کی خلاف شرع چکنی چوپڑی باتوں سے
مسلمانوں کے عقائد، اعمال کو برباد کر دیتے ہیں، ایسے
لوگوں کی صحبت سخت خطرناک ہوتی ہے ان کے پاس جو نام
قائم ہے یہ اپنی جہالت اور کمزوری کو چھپائے رکھنے کے لیے بزرگوں
کا بار بار ہر موقعہ پر نام لیتے ہیں ان سے پوچھیے کہ جن بزرگوں کا یہ نام لیتے
ہیں مثلاً حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قطب ربانی اور حضرت خواجہ معین الدین
حسینی سلطان الہند کے اشغال و اوراد کیا تھے صبح و مسا ذکر

و تسبیح نماز و عبادت میں مشغول رہتے تھے یا جو تم تقاریر کرتے اور حقائق بیان کرتے رہتے ہیں نہ یہ بعض یہی کیا کرتے تھے ان کی تصنیفات، ملفوظات، مواعظ موجود ہیں یہ سب ان کے اعمال و اقوال کی تردید کرنے میں شاید نہیں کرتے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے موقعہ بموقعہ ایسے لوگوں سے جو قدیم سے چلے آرہے ہیں مختلف انداز میں آگاہ کیا ہے فرماتے ہیں :۔

این مدعیان در طلبش بیخبر اند
کان را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

یہ بلند بانگ، معرفت و وصول الی اللہ کے دعویدار اس ذات قدسی صفات کی طلب و جستجو میں محض بیخبر ہیں جس کو اس کی خبر ہوئی پھر اس خبردار کی خبر تک واپس نہیں آئی۔

اور فرماتے ہیں :۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستی نباید داد دست

بہت سے ابلیس انسانی شکل و صورت میں ہوتے ہیں۔ (ان سے خبردار رہو) اور ہر ایک کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہ دو۔

دور باش از اختلاط یار بد
یار بد بدتر بود از مار بد

بُرے دوست کے میل جول سے دور رہ۔ بُرا دوست سانپ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

اولیاء کرام کے ملفوظات جن کے عام فہم ترجمے ہو چکے ہیں یہ مرشد، رہنما اضل (گمراہ کن) کے معلوم کرنے کی کسوٹی ہیں۔ ان کا مطالعہ کیجئے اور بار بار غور سے دیکھئے ان میں ان بزرگوں کا جو حال و قال تھا وہ مشعل راہ ہدایت ہے کہ وہ مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور یا کبار بزرگ آنحضور پُر نور کے حقیقی اور سچے متبع تھے جو شیخ ان باتوں کے مطابق پایا جائے تو وہ شیخ بنائے جانے کے لائق ہے اور جو صرف باتونی ہے وہ نہ صرف لائق رد ہے بلکہ ان سے دور رہنے ہی میں اپنی عافیت اور ایمان کی حفاظت و صیانت ہے، الغرض بیماریٔ دل کے علاج کی فکر کی جائے اور اس کی زائل شدہ صحت کے واپس آنے کی صحیح کوشش کی جائے تو حسب وعدہ الٰہی والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا جو ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو راستے دکھاتے ہیں، صحت کی راہ مل ہی جائیگی اور مریض کامل و شفایاب ہوگا۔ اور اگر دل کا علاج نہ کیا گیا تو یہ بیماری ایسی مہلک ہے کہ اس کی کبھی انجام کفر تک پہونچ جاتا ہے۔ یہ بات قطعی ہے کہ انسان کو قلب سلیم لیکر خدا کی بارگاہ میں دنیا سے جانا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نفس کو جو سب سے بڑا دشمن ہے اس کو خواہشات سے پاک و صاف کیا جائے اور کامیابی اسی صورت میں حاصل ہو گی۔ قد افلح من زکٰھا۔ اور اگر خواہشات میں نفس کو دبا کر رکھا جائیگا تو ناکامی یقینی ہے قد خاب من دسّٰھا۔ ہر دشمن جس کے ساتھ حسن سلوک برتا جائے تو وہ احسانمند ہو گا مگر نفس انسانی ایسا دشمن ہے کہ اس کا مقصد جوں جوں پورا کیا جائے گا وہ اور زیادہ سرکش ہو گا۔ لہذا ضروری ہے کہ گناہ سے احتراز کیا جائے، غافلوں کی صحبت سے کنارہ کشی کی جائے اجنبی عورتوں کے ساتھ تنہائی اور ان سے ہم کلامی سے

بہت دور رہے، اس مالدار کی ہم نشینی سے پرہیز کرے جس کو اپنے مال پر گھمنڈ ہو۔ خواہشات نفسانی کے خلاف کیا جائے۔ اس پرہیز کے ساتھ احکام شریعت کی پابندی کو لازم کرلے، ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو۔ مرشد کامل کی تلاش جاری رہے اور اس کے ملنے تک اہل دل بزرگوں کی تالیفات کا غور و توجہ سے مطالعہ کرے اور ان میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے مطابق عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ بموجب ارشاد الٰہی لیس للانسان الا ما سعی، کوشش کامیاب ہوگی۔ حاصل کلام یہ کہ قلب سلیم وہی ہے جس میں خدا کے محبوب و معبود کی معرفت و محبت ہو۔

اللھم ارزقنا حبک وحب من یحبک، آمین۔

●●

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبا اِدھر نکلے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

قطعہ

سلطان مدینہ

شام و سحر ہے مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہو جائے اِدھر رحمتِ سلطانِ مدینہ
صادق دم آخر ہے یہی آرزو میری
آجائے نظر صورتِ سلطانِ مدینہ

میر صادق علی صادق

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

حافظ سید محمد عبداللہ قادری کرنولی متعلم جماعت فاضل ثنوی

وراثت کا اسلامی نظام

اصحابِ خرد و دانش کے نزدیک یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام ایسا جامع اور مکمل مذہب ہے کہ اس میں ضروریاتِ انسانی اور نظامِ حیات کا مدلّل و مکمل حل موجود ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اسلام کے مکمل ہونے کی تصدیق بھی فرمائی اور ارشادِ ربانی ہے الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ (ترجمہ) آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا، اسی لئے تہذیب و معاشرت کا کمال مذہبِ اسلام کی عمل آوری میں مضمر ہے جس طرح اسلام زندگی کے تمام تقاضوں کو مکمل طریقہ سے حل کردیا اور ہر شعبۂ حیات میں نہایت جامع اصلاحی نظام پیش کیا اسی طرح جب انسان عالمِ فانی سے کوچ کرتا ہے تو اس کے مال و متاع کے لئے ایک ایسا جامع نظام بھی مرتب کیا کہ جس کی نظیر ملنا ناممکن ہے

انسان جب اپنے مال و متاع کو چھوڑ کر دارِ فانی سے دارِ باقی کو چلا جاتا ہے تو اس کے مال پر اس کا حقِ ملکیت باقی نہیں رہتا مذہبِ اسلام نے حقِ ملکیت کو ورثہ میں ایسے صحیح اصولوں کے ساتھ تقسیم کی جس سے مسئلہ میراث میں انسانی اختلاف اور باہمی کشمکش ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہوگئی زمانہ جاہلیت میں طاقتور انسان ترکہ پر قابض ہوجاتے تھے مرنے والے کی بے سہارا بیوی اور یتیم و مسکین بچوں کو میراث سے محروم کردیتے تھے، قرآن کریم نے اس مذموم خصلت کو اپنے بلیغانہ اسلوب میں اس طرح بیان کیا تاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حبا جما ترجمہ: اور مالِ وراثت سمیٹ سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بے حد محبت رکھتے ہو۔

تقسیم میراث کے قانون کو علم فرائض کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے علم فرائض نہایت حکیمانہ ہے اور ایسے مصالح پر مبنی ہے کہ جس کا ادراک عقلِ انسانی نہیں کرسکتی چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے اباؤکم وابناؤکم

لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعاً فریضۃ من اللہ ان اللہ کان علیما حکیما۔ (ترجمہ) تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ دادا اور اولاد میں فائدے کے لحاظ سے کون تم سے زیادہ قریب ہے یہ فرائض اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہیں بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو حکمتیں اس نظام میراث میں ملحوظ رکھی گئی ہیں وہی قابل اعتبار ہیں انسانی عقلیت یعنی ان حکمتوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی رب حکیم نے بنیادِ تقسیم انسانی عقل اور ان کے اجتماعی اور انفرادی آراء پر نہیں رکھا کیوں کہ انسانوں کے پاس نفع و نقصان اور ترجیح و تفصیل کا کوئی معیار نہیں ہے اس لئے انسان کا فیصلہ یقیناً اس تقسیم میراث میں درست نہیں ہوتا پس معلوم ہوا کہ تقسیم میراث کا دار و مدار انسان کے سمجھے ہوئے منافع و مضار پر نہیں ہے بلکہ رب حکیم کی ان حکمتوں پر مبنی ہے جن کو وہی بہتر جانتا ہے جو تمہارے اور ہمارے حق میں مفید ہیں۔

علم فرائض کی اہمیت نبی کریم صلعم کے اس ارشاد سے ظاہر ہے تعلموا الفرائض وعلموھا الناس فانھا نصف العلم، وھو ینسیٰ وھو اول شئی ینزع من امتی۔ ترجمہ: لوگو علم فرائض سیکھو اور سکھلاؤ اس لئے کہ وہ نصف علم ہے اور وہ بھلا دیا جائیگا سب سے پہلے جو چیز میری امت سے اٹھائی جائے گی وہ علم فرائض ہے۔ علم فرائض کو نصف علم اس لئے فرمایا گیا ہے کہ اس کے سب مسائل قرآن و حدیث سے مستنبط ہیں۔ بخلاف احکام شرعیہ کے ان میں بعض قرآن و حدیث سے اور بعض قیاس و اجتہاد سے ثابت ہیں اور اس علم کے ایک مسئلہ پر دیگر احکام کے سو مسئلوں کے برابر ثواب حاصل ہوتا ہے اور اس علم کے سیکھنے اور سکھلانے میں بڑی محنت و مشقت ہوتی ہے گویا علم فرائض استنباط، ثواب اور مجاہدہ کے لحاظ سے نصف علم ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا مسلمانو! علم فرائض ایسی توجہ اور محنت سے سیکھو جس طرح قرآن کریم کو سیکھتے ہیں۔ (دارمی)

اسی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس علم کے سیکھنے اور سکھلانے نہایت انہماک کے ساتھ مصروف رہتے تھے ان حضرات صحابہ کرام کی کد و کاوشوں کا ہی ثمرہ ہے کہ آج امت کو یہ علم نصیب ہوا۔ اس علم میں جن اصحاب کرام کو نہایت اہم مقام حاصل تھا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر۔ حضرت عثمان غنی۔ حضرت علی۔ فقیہ امت حضرت عبداللہ ابن مسعود۔ حضرت عبداللہ ابن عباس۔ حضرت زید بن ثابت۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضوان اللہ عنہم اجمعین

اسلام ایک خاص انداز سے معاشرہ اور خاندان کی اصلاح اور تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اس نے اپنا ایک تفصیلی نظام حیات وضع کیا جس کا قانون وراثت ایک جز ہے اس کو سمجھنے کے لئے پہلے خاندان کی ساخت افراد خاندان کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور ان کی نفسیات کو سمجھنا پڑے گا اس کے بغیر علم فرائض کی معنویت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

خاندان انسانی سماج کا سب سے قدیم ادارہ ہے، اس کی شکل بحالات زمانہ بدلتی رہی ہے مگر اس کا وجود

ہمیشہ باقی رہا۔ خاندان سے انسان کی بعض ابتدائی اور بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اس کا کوئی ایسا بدل وجود میں نہیں آیا جو اس سے متعلق ضرورتوں کو پورا کر سکے یہی وجہ ہے کہ خاندان سے انسان کی وابستگی ماضی میں بھی رہی ہے آج بھی مسلسل جاری ہے اور مستقبل میں بھی انسان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکے گا خاندان سے انسان کی وابستگی محض محتاجی کی بنا پر ہی نہیں بلکہ اس کی نوعیت جذباتی بھی ہے اور اس کی فطرت کا تقاضا بھی ہے اور اس سے بے پناہ محبت ہوتی ہے وہ اس سے غیر معمولی قرب محسوس کرتا ہے غیروں کے درمیان اجنبیت کا جو احساس ہوتا ہے خاندان میں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے بلکہ خوشی میں مزید اضافہ بھی ہوتا ہے اور اتنی وابستگی ہوتی ہے کہ بڑے سے بڑے صدمے کو بھی گوارہ کر کے بالعموم اپنا تعلق منقطع کرنا نہیں چاہتا خاندان سے فطری لگاؤ کی بنا پر انسان اپنی دولت ان پر صرف کرتے ہوئے ایک طرح کی مسرت اور خوشی محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات پر ان کو ترجیح بھی دیتا ہے اور اس کے پیچھے کوئی خارجی دباؤ بھی نہیں ہوتا بلکہ اس کو محبت اور جذبہ ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کی ضروریات اور آسائش و آرام کے سامان فراہم کرے اور اس کو خوش حال اور ترقی یافتہ دیکھے

یہ ایک حقیقی واقعہ ہے کہ خاندان کے افراد سے انسان کا یکساں تعلق نہیں ہوتا جو افراد فطری طور پر بہت ہی قریب ہوتے ہیں اور عملاً جن کا تعاون سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے اس کا تعلق بھی غیر معمولی ہوتا ہے اس کے برعکس جو افراد خاندان جس قدر دور ہوں ان کا تعلق بھی اتنا کم ہوتا ہے اسی تعلق کی بنا پر انسان معاملہ کرتا ہے دور کے افراد کے مقابلہ میں قریبی افراد سے محبت بھی زیادہ ہوتی ہے اور وہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک بھی کرتا ہے انسان کے ان ہی فطری جذبات پر اسلام نے خاندانی نظام کی بنیاد رکھی اس نے اہل خاندان سے حسن سلوک کی تعریف اور بدسلوکی کی مذمت کی اور موجب گناہ قرار دیا۔

کسی بھی نظام کو وجود میں لانے کے لئے محض اخلاقی تعلیم کافی نہیں ہوتی بلکہ قوت قانون کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ خلاف ورزی سے روکا جا سکے خاندان سے جذبہ تعاون کے باوجود بعض وقت انسان اس فطری داعیہ پر عمل نہیں کرتا بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس کے خلاف تعاون بھی کر بیٹھتا ہے اسی وجہ سے اسلام نے ترغیب و تشویق کے ساتھ ساتھ قانون کے زور سے اس بات کا پابند بنا دیا کہ خاندان والوں کا تعاون کرے والدین اور اولاد کا تعلق اس کی ایک واضح مثال ہے ٹھیک یہی نوعیت وراثت کی ہے وراثت انسان کی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے۔ اسلام نے اس فطری تقاضے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی آزادی نہیں دی بلکہ قانون کے ذریعہ اس کا پابند بنا دیا۔ یہاں ہم پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وراثت انسانی فطرت کا مطالبہ ہے یا نہیں؟ یہ ایک حقیقت ہے انسان اپنے کنبہ اور خاندان ہی کو اپنا جائز وارث تصور کرتا ہے زندگی میں جس طرح اپنے مال میں غیروں کے حق کو تسلیم نہیں کرتا اسی طرح مرنے کے بعد پسند نہیں کرتا کہ غیر کے ہاتھوں میں چلی جائے انسان کے اندر ملکیت کا بہت شدید احساس ہوتا ہے جو چیز اس کی ملکیت میں ہے جس کو وہ محنت اور مشقت سے

حاصل کیا ہے یہ چاہتا ہے کہ زندگی بھر اس کا قبضہ رہے اور اس کے بعد ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جو زندگی میں نسب سے زیادہ قریب تھے اس کے بغیر اس کے احساس ملکیت کو تسکین نہیں ہوتی وراثت کی بنیاد انسان کا یہی فطری احساس ہے

جس طرح دنیا کے بیشتر متمدن ملکوں کے دستور میں بالعموم کچھ اصولوں کو ناقابل تبدیل اور لازمی تسلیم کر کے یہ طے کر لیا گیا ہے کہ حالات میں خواہ کیسی ہی تبدیلی رونما ہو اس میں تغیر و تبدل نہیں کیا جائیگا اور نہ وقتی یا عارضی مصلحت سے انھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے مثلاً ہمارے ملک ہندوستان ہی کو لیجئے اس کے موجودہ دستور میں بنیادی حقوق کی آزادی بطریق غیر متبدل اصول کے مان لی گئی ہے اس لئے جب بھی کوئی قانون بنے گا اس کا لحاظ رکھا جائیگا کہ وہ اس اصل سے متعارض نہ ہونے پائے الّا یہ کہ ترمیم کے ذریعہ یہ اصول وضع ہی کو ختم کر دی جائے۔ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ موکد طریقہ پر کیونکہ شریعت کے کسی بھی جز میں ترمیم و نسخ کا کسی کو قطعاً اختیار نہیں اس لئے کہ یہ خدائی قانون ہے خدا نے اس کو خاتم النبیین صلعم کے ذریعہ سے مکمل کر دیا) شریعت کے قوانین میں بھی کچھ چیزیں بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں ان ہی میں سے ترکہ کے استحقاق میں اقربیت والا اصول بھی ہے جو بلا اختلاف تمام سنی مکاتب فقہ میں مسلم ہے یعنی مرنے والے کا ترکہ اصولاً اس شخص کو ملے گا جو نسباً میت سے قریب تر ہو اور یہ اصول براہ راست قرآن مجید و احادیث سے ماخوذ ہے ارشاد ربانی ہے للرجال نصیب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او كثر (سورہ نساء آیت)

ترجمہ۔ مردوں کو مقررہ حصہ ملے گا اس مال میں سے جو والدین یا قریب تر رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اسی طرح ان عورتوں کو جو میت سے قریب تر ہیں انھیں بھی حصہ ملے گا خواہ مال کم ہو یا زیادہ، اسی طرح حدیث شریف میں ہے۔ الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فهو لاولى رجل ذكر (ترجمہ) پہلے اہل حقوق (ذوی الفروض) کو ان کے حقوق دو اس کے بعد جو کچھ بچ جائے وہ قریب ترین مرد کا حق ہے

اس بارے میں شارع علیہ السلام نے صرف اس اصول کے بتا دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی بعض ضروری تفصیلات بھی بیان فرما دیں جو بالکل فطرت انسانی کے مطابق ہیں چنانچہ اقرب و ابعد ہونے کا فیصلہ فطری اور طبعی معیار پر ہی کیا گیا یعنی مرنے کے وقت جو میت سے نسبی طور پر قریب تر ہے اسے قریب قرار دیا اور جو بعید ہے اسے بعید اور جن مواقع پر عقل انسانی قرب و بعد کا فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کرتی ہے وہاں صراحت کر دی گئی کہ ان میں کون قریب ہے اور کون بعید مثلاً متوفی کا باپ اور بیٹا کیونکہ نسبی طور پر دونوں بظاہر یکساں قرب رکھتے ہیں اس لئے عام انسان کے لئے فیصلہ کرنا دشوار ہوتا۔ اس تفصیل کے سامنے آجانے کے بعد اصول نمایندگی جسے اختیار کر لینے کے لئے آج کل بہت زور دیا جا رہا ہے تسلیم کر لینے اور اسی کی روشنی میں ترکہ کی تقسیم کا قانون بنا دینے سے (مثلاً اصلی یعنی براہ راست اولاد کی موجودگی میں مرحوم بیٹوں کی اولاد کو بقدر حصہ پدر ترکہ ملنے کا قانون بن جانے سے) اسلام کے نظام وراثت

ماہنامہ انوار نظامیہ رجب [illegible]

کی مذکورہ بنیاد اور غیر متبدل اصل قطعاً منہدم ہو جائیگی اور یہ بات کسی بھی شیدائی اسلام کے لئے قابل تحمل اور گوارہ نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ اہل علم کے درمیان آج تک اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہوا دیکھئے مشہور محقق حنفی عالم ابوبکر الجصاص یہی نقل فرماتے ہیں

ولم یختلف اهل العلم فی ان المراد بقوله تعالیٰ یوصیکم الله فی اولادکم اولاد الصلب وان ولد الولد غیر داخل مع ولد الصلب وانه اذا لم یکن ولد الصلب فالمراد اولاد البنین دون اولاد البنات

(آج تک) اہل علم کا اختلاف اس بارے میں نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قول " یوصیکم الله " میں براہ راست اولاد مراد ہے اور (نہ اس میں اختلاف ہوا کہ) صلبی بیٹے کی موجودگی میں پوتا اس کا مصداق نہیں ہے اور جب صلبی اولاد نہ ہو تب لڑکے کی اولاد (یعنی پوتا پوتی) ترکہ پانے کے مستحق ہونگی لڑکی کی اولاد نہیں۔

(احکام القرآن)

علم فرائض کے ماہر مشہور صحابی رسول صلعم حضرت زید بن ثابت سے یہی صراحت نقل کی ہے فرماتے ہیں

ولد الابناء بمنزلة الولد اذا لم یکن دونهم ولد ذکرهم کذکرهم واناثهم کاناثهم۔ یرثون کما یرثون ویحجبون کما یحجبون

یرث ولد الابن مع الابن ترجمہ پوتے لڑکوں کی عدم موجودگی میں بمنزل بیٹے کے ہوتے ہیں اور بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوتا۔ بخصوص ترکہ سے محروم ہو جانے والے رشتہ داروں یا یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ دار قرار نہ دینے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شریعت نے اس بچے کی کوئی رعایت نہیں کی اور اسے یوں ہی بے یار و مددگار ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کے لئے چھوڑ دیا ہے نہیں بلکہ اس کی کفالت اور اسے ضروریات زندگی فراہم کرنے کے لئے خواہ اس کا دادا موجود ہو یا نہ ہو اور خواہ دادا کے پاس مال ہو یا نہ ہو ہر حالت کے لئے قانون شریعت کے اندر بہت تفصیل کے ساتھ سفارشیں موجود ہیں اور ترکہ کی موہوم رقم پر دار و مدار رکھنے کے بجائے مختلف احوال میں حسب موقع (اگر بچہ مال دار نہیں ہے تو) مختلف افراد پر اس کے نفقہ کی ذمہ داری محض اخلاقاً نہیں بلکہ قانوناً ڈالی گئی ہے مثلاً اکثر صورتوں میں ایسے نادر بچے کی کفالت اولاً دادا کے ذمہ مقرر ہے (اصول کی روشنی میں ہوتی) ہے اور نفقہ کی یہ ذمہ داری بچوں کے بالغ ہونے تک عائد ہوتی ہے مسلک احناف میں تو اختلاف دین کے باوجود یتیم پوتے کا نفقہ دادا کے ذمہ ہے (ہدایہ اولین) بچے کی خوش حال والدہ موجود ہو اور دادا بھی تو اس کا نفقہ دونوں پر ہوگا مگر دادا پر دو حصے والدہ پر ایک حصہ جیسا کہ بدائع میں ہے ولو کان له ام وجد کانت النفقة علیهما اثلاثا الثلث علی الام والثلثان علی الجد (ترجمہ) اگر بچے کی والدہ اور دادا دونوں موجود ہوں تو بچے کا نفقہ دونوں پر عائد ہوتا ہے والدہ پر ایک حصہ دادا پر دو حصے، ماں اور دادا کے بعد یتیم بچے کی ذمہ داری چچا

اور دوسرے ان رشتہ داروں پر (ترکہ کی نسبت
کی مقدار) عائد ہوتی ہے جو اس بچے کے شرعاً وارث بن سکتے
ہیں۔ یہاں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ محض اخلاقی
ذمہ داری نہیں ہے بلکہ قانونی ہے اور ان لوگوں پر اس
کا نفقہ واجب ہے بصورت خلاف ورزی جبراً وصول
کیا جا سکتا ہے۔ ہدایہ میں ہے ویجب ذالک علی
مقدار المیراث ویجبر علیہ۔

علمائے احناف نے تمام ورثہ پر بعد حصص یتیم بچہ
کے نفقہ کا وجوب براہ راست قرآن مجید و علی
الوارث مثل ذالک سے اخذ کیا ہے۔ یہ تفسیر
حضرات صحابہ و تابعین میں سے حضرت عمر، زید بن
ثابت، حسن، ذویب، عطا، قتادہ رحمہم اللہ سے
مروی ہے (احکام القرآن)

اس بچہ کا اگر کوئی رشتہ دار نہ ہو یا ایسا کوئی
نہیں جو بوجہ افلاس کے اس یتیم کا بوجھ اٹھا سکے تو پھر
حکومت پر ذمہ داری ڈالی جا سکتی ہے کہ وہ اس کا
خرچ برداشت کرے کیونکہ بعض شکلوں میں باپ کی
موجودگی میں بھی حکومت ذمہ دار ٹھیرائی جا سکتی ہے تو
اس صورت میں بطریق اولیٰ ذمہ دار بنائی جاسکے گی۔ مشہور
فقیہ ابن ہمام فرماتے ہیں۔ ان یکونوا ذوی
الاولاد فقراء وھم صغار وکبار عاجز
والاب ایضا عاجز عن الکسب قیل
نفقتھم فی بیت المال لان الاب
اذا کان بھذہ الصفۃ فنفقتہ
فی بیت المال (ترجمہ) اگر سب بچے نادار
اور چھوٹے ہوں یا بڑے مگر اپاہج ہیں اور باپ
بھی معذور ہے تو ان کا نفقہ بیت المال سے دیا جائیگا
کیونکہ اس جیسی حالت میں باپ کا نفقہ بھی بیت المال
پر ہے۔

یتیموں کی کفالت سے متعلق ان خاص احکامات
کے علاوہ عمومی نوعیت کے وہ ہدایات علٰحدہ ہیں جن
میں تمام مسلمان پر بحیثیت مجموعی ان کی دیکھ بھال کا فریضہ
عائد کیا گیا ہے۔

ان امور کے علاوہ اپنے بچوں کو مالی منفعت پہنچانے
کی ایک اور شاہراہ کھلی ہے وہ ہے وصیت کی مشروعیت
جو ترکہ پانے والوں کے لئے تو بند ہے اس راہ کے ذریعہ
بسا اوقات غیر وارث کو ترکہ کی مقدار سے بھی زیادہ دیا
جا سکتا ہے۔

اگرچہ ترکہ کے نظام کی مشروعیت کے بعد وصیت
ضروری تو نہیں رہی مگر غیر وارث رشتہ داروں کے
لئے باتفاق علماء و فقہاء اس کا استحباب اب بھی باقی ہے
امام شعرانی فرماتے ہیں اجمعوا علی ان الوصیۃ
مستحبۃ بلکہ متعدد علماء کے نزدیک جن میں بعض صحابہ
بھی ہیں (غیر وارث کے لئے) وصیت کرنا اب بھی واجب
ہے ان علماء کے نزدیک آیت وصیت کتب علیکم
اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیر
ن الوصیۃ۔ تم پر موت کا وقت آنے سے پہلے وصیت
کرنا لازم ہے اگر مال چھوڑ کر مر رہے ہو۔ ایک اعتبار
سے یعنی ورثہ کے لئے منسوخ اور ایک حیثیت سے
یعنی غیر وارث کے لئے غیر منسوخ جیسا کہ علامہ بدر الدین
عینی شارح بخاری فرماتے ہیں اس آیت کو بعض علماء
وارثوں کے بارے میں منسوخ کہتے ہیں اور

غیر وارثوں کے لئے غیر منسوخ ایسا کہنے صحابہ و تابعین
میں حضرت عبداللہ بن عباس، حسن، مسروق، سعید
بن جبیر، ضحاک، مسلم بن یسار وغیرہم ہیں
(عمدۃ القاری)

بدرجہ مجبوری یتیم بچہ کی پرورش اور کفالت
کا جب دوسرا کوئی بندوبست نہ ہو اور دادا دولت
چھوڑ کر مر رہا ہو اس وقت ان حضرات کا قول
بمشورہ علماء اختیار کرتے ہوئے دادا پر وصیت
کرنا ضروری قرار دیا جا سکتا ہے اس قول کو اختیار
کرنے کے بعد اگر دادا وصیت کئے بغیر بھی مر جائے
تو اس کے ترکہ سے ابن حزم ظاہری کے مسلک کے
مطابق بقدر وصیت محروم الارث پوتے کو مال
دلوایا جا سکتا ہے اصحاب ظواہر کے امام ابن حزم
کے یہاں چونکہ وصیت واجب ہے اس لئے ان کے
نزدیک وصیت کئے بغیر وفات پا جانے کی حالت
میں میت کے مال سے اتنی مقدار جس کا تعین ورثہ
یا وصی کے مشورہ سے ہوگا محروم الارث کو دلوائی
جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ شریعت نے اس بچہ کی پرورش
کی قانوناً ذمہ داری بہرحال کسی نہ کسی پر ڈالی ہے
اور اسے یونہی بے سہارا نہیں چھوڑ دیا گیا لیکن جن
لوگوں کی نظر کی پرواز اسلام کے وسیع ترین اور
ہر شعبہ زندگی پر حاوی قوانین تک نہیں ہے اس لئے
اسے صرف چند عبادات بلکہ رسومات اور جاگیردارانہ
قوانین کا مجموعہ سمجھتے ہیں وہ محجوب الارث پوتے
کا معاملہ اچھال کر شریعت پر زبان طعن دراز
کرنے لگتے ہیں مگر اپنی کوتاہ نظری کا ماتم نہیں کرتے
یاللعجب یاللعجب۔

••

تضمین برباعی حضرت شیخ سعدی شیرازی رح

سرِ عرش رفعتِ منتہیٰ
وہ شبِ دنیٰ تری ہمروی
کہا ہر ملک نے کہ یا نبی
بلغ العلیٰ بکمالہٖ

تیرا نور نورِ کمال ہے
تو، سراپا حسن و جمال ہے
ترا جلوہ جلوۂ ایزدی
کشف الدجیٰ بجمالہٖ

ترے وصف کی نہیں انتہا
کہ ہے بعدِ حمد تری ثنا
تری مدح میں ہے قرآن بھی
حسنت جمیع خصالہٖ

یہی وصفِ قلبِ حضور ہے
یہی شغلِ ربِ غفور ہے
رہے کیوں نہ وردِ زباں یہی
صلوا علیہ و آلہٖ

جنبش خیرآبادی

از: مولانا سید قطب الدین حسینی صابری
(امیر جامعہ نظامیہ)

قرآن اور اُمّی

آج کی دنیا ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہے۔ اس دنیا میں اَن پڑھ اور جاہل و بے علم شخص کا کوئی مقام نہیں مگر منشاء خداوندی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر ہمارے لئے، آج کی دنیا کیلئے اُمّی رکھا گیا تاکہ آپ کی امیت اور آپ کی تعلیمات کی ہمہ جہتی اور حسن و خوبی ہماری عقلوں کے لئے معجزہ کا کام کرتی رہے۔ کسی بھی نبی کا معجزہ عارضی ہوتا تھا" موقتی طور پر دس پانچ منٹ کے لئے دکھایا گیا اس کے بعد قصہ بن کر رہ جاتا۔ مگر ختمی مآب کا معجزہ زندہ اور دوامی ہے، جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

بخاری شریف کی روایت کہ :-

" جتنے انبیاء گزرے، سب کو مختلف نوعیت کے معجزات ملے، اور میرا معجزہ وہ قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمایا ہے۔"

انبیاء کو جو معجزات عطا ہوتے تھے وہ اُن فنون سے تعلق و مناسبت رکھتے تھے کہ جن میں کسی بھی نبی کے زمانے کے لوگ ترقی یافتہ ہوتے تھے، جیسے ساحروں کو عاجز کرنے والے حضرت موسیٰ کے معجزات یا طبیبوں کو عاجز کرنے والے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات۔

معجزات کا مقصد عوام کو عاجز کر کے تعلیمات کی طرف راغب کرنا ہوتا ہے۔ اصل مقصود تعلیمات کی اشاعت ہوتی، نہ کہ معجزات کی نمائش، نبی آخر الزماںؐ کا معجزہ اُن کی تعلیمات "قرآن" ہے۔ چونکہ رسالتمآبؐ کے بعد آنے والا زمانہ ایسا تھا کہ جس میں انسان رسل و رسائل میں ترقی کر کے ایک اہلِ ملک دوسرے ملک والوں سے، ایک قوم دوسری قوم سے ربط و تعلقات قائم کرنے والی تھی، اس طرح عالمی انسانوں میں ہم آہنگی اور وحدت پیدا ہونے والی تھی۔ انسان کی عقل و سمجھ ارتقائی منازل طے کرنے والی تھی، علم و حکمت کے دور کا آغاز ہونے والا تھا، اس لئے قرآن جو ایک جامع کتاب ہے اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ روانہ کی گئی۔ جو علوم و فنون اور قوانین کا مجموعہ ہے۔ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ..... سماجی اصلاحات کی ایک مکمل اسکیم اور اخلاقیات کا مرقع ہے۔ اس کے علاوہ طبیعیاتی نظریات اور معاشیاتی اصول بھی اس کے اہم اجزاء ہیں۔ عالمی انسانوں کو ایک منتہ کرا اقتدارِ اعلیٰ (احکم الحاکمین) سے وابستہ کر کے اور ایک عالمگیر قانون کے تحت ساری نوع انسانی کو لا کر، نوع انسانی میں وحدت اور یکسانیتِ عمل پیدا کرنا اس کتاب کے اہم مقاصد سے ہے۔

نہ صرف اخلاقیات، روحانیات اور قوانین میں انسان کی تربیت اس کتاب نے کی ہے، مادی ترقی کیلئے بھی انسان کو مواقع دیئے ہیں۔ اور طبیعیات کے اہم نظریات کا انکشاف بھی کیا ہے۔ ان تمام نظریات کو اس وقت یہاں بیان کرنا ناممکن ہے۔ البتہ چند اہم نظریات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ لوگوں کو یہ اندازہ ہو سکے کہ

قرآن کن کن علوم و فنون پر حاوی ہے۔

ذرات کیمیائی کا بہت ہی باریک ہونا۔ ہوا میں آکسیجن کا اعتدال۔ کرہ زمین کے اندرونی حصہ میں گرمی۔ کائنات کی اصل ریڈیم ہونا۔ تمام کائنات ایک جگہ گڈمڈ تھی پھر پھٹ کر اجرام فلکی قائم ہوئے۔ تمام جاندار چیزوں کا اصل پانی ہے۔ مرد کا دماغ عورت کے دماغ سے بڑا ہوتا ہے۔ فوٹوگرافی عجائبات قدرت سے ہے۔ پہاڑ دراصل پانی کے خزانے ہیں۔ زمین کی طرح سورج بھی ٹھنڈا ہوتا جارہا ہے۔ ستارے آپس کی کشش سے قائم ہیں۔ فضاء کی کہیں انتہا نہیں۔ زمین کا بنتی تھی پھر ٹھنڈی ہو گئی تو اس پر جہاں آباد ہوا۔ موجودہ تمدن کی بنیاد لوہے پر ہے۔ چاند خود روشن نہیں بلکہ سورج کی روشنی کا انعکاس کرتا ہے۔ ستارے ایک نظام کے تحت اپنے اپنے مداروں پر چلتے رہتے ہیں۔ جراثیم اور ان کے نقصانات و فوائد۔ زمین گھومتی ہے، اس کے اندر آگ کا مادہ ہے۔ نباتات میں بھی نر و مادہ ہیں۔ ہوائیں نباتات کو بار آور کرتی ہیں۔ کیمیائی تالیف و ترکیب۔ اجرام فلکی ایک دن چھوٹ جائینگے۔ ستاروں میں آبادی ہے۔ ریڈیو اور اس کے آثار عظیمہ ـــ غوطہ زن جنگی کشتیاں۔ اصول Aeronautics ، اصول Navigation زہریلی گیسیں اور ان کے تباہ کن نتائج، مادہ اور اس کی مخفی طاقتیں۔ ان طاقتوں کا قیام و نظام۔ دنیا کے اصل ایٹم یعنی اجزاء لایتجزیٰ ہیں۔ ستارے آفتاب کے گرد چکر کاٹتے ہیں۔ بجلی اور جمادات میں مثبت و منفی دو قوتیں ہیں جنکی پیدائش باہمی اتصال پر موقوف ہے۔ بجلی میں پھاڑنے کی قوت ہے۔ جو پانی زمین سے چھوٹتا وہ بارش بن کر آتا ہے۔ انسان کی انگلیوں کے نقوش و خطوط ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ نظام عالم میں کھینچنے، توڑنے، جوڑنے کی قوتیں ہیں۔ کسی بھی چیز کے سایہ پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ جنین، ماں کے پیٹ میں تین پردوں میں رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چودہ سو سال کی کتاب میں یہ حقائق و نظریات جن نتائج پر ترقی یافتہ انسان صدیوں کی جدوجہد اور کاوش کے بعد پہنچا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا معجزہ ہوگا۔ آئندہ مزید کیا کیا انکشافات، قرآنی آیات پر غور و فکر و تفحص کرنے سے ہوں گے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کیونکہ ساری کائنات انسان کے زیر تسخیر آجانے کی ایک اہم خبر قرآن نے دے رکھی ہے۔ (اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ و لتبتغوا من فضلہ و لعلکم تشکرون۔ و سخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منہ۔ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔) اس عالمی تسخیر کے لئے انسان جو جو ترقی کرے گا سب اس پیشین گوئی میں داخل رہیں گے۔

یہ ساری روحانی سے لیکر مادی تعلیمات قرآن میں موجود ہیں۔ اور یہ قرآن کس کے ذریعہ بھیجا گیا ہے۔ ایک امی کے ذریعہ جو ایک جاہل قوم کے فرد تھے اور جنھوں نے ایک تاریک ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اب ہم آپ کے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔

چودہ سو سال قبل اگرچہ ایران، مصر، روم میں کچھ علوم و فنون و تہذیب کی روشنی موجود تھی مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ صرف عرب تجار ان ملکوں کو تجارت کے اغراض پر جاتے تھے اور تجارتی اموال کا تبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ نہ کوئی علم و تہذیب حاصل کرنے کی غرض رکھتا تھا اور نہ اس غرض سے

ان لکوں کو کوئی جانتا تھا۔ نہ عربوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ مدرسے تھے نہ کتب خانے۔ نہ علوم و فنون سیکھنے کی دلچسپی۔ تمام ملکِ عرب میں گنتی کے چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عرب قوم کی اس عام جہالت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے کہ

وَمَا آتَيْنَاهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا
وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ

عربوں کا اہم سرمایہ ایک اعلیٰ درجہ رکھنے والی فصیح و بلیغ زبان عربی تھی۔ ادبی مذاق ان کے اندر ضرور تھا مگر زمانہ جاہلیت کے ادبی کارناموں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربوں کے معلومات محدود تھے۔ تہذیب و تمدن کے اعتبار کرتے انتہائی پست تھے۔

اوہام پرستی، کواکب پرستی، بت پرستی۔ غرض خدائے واحد کے سوا سب پرستیاں رائج تھیں۔ خاندان پرستی اور قبیلہ پرستی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ عربوں کا معاشرہ گندگی کے اس درجہ کو پہنچ چکا تھا کہ ان کی اصلاح ناممکن ہو چکی تھی۔ ان کی اصلاح کسی انسان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ یہ صرف قرآنی تعلیمات و قوانین ہی تھے جو اس سخت مریض کو شفا بخش سکے۔ عربوں کے معاشرے کو پاک کیا بھی تو اس درجہ، وہ دوسروں کے لئے رہنما بن گئے۔ رہزن رہنما بنا دیئے گئے۔ عرب قوم کے معاشرے کے اس احیاء کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہے کہ

ولولا فضل الله عليكم ورحمته، ما زكىٰ منكم من احدٍ ابداً۔ ولكن الله يزكّى من يشآءُ والله سميع عليمٌ یہ ہے وہ ماحول جسیں قدرت نے آپ علیہ السلام کو جنم دیا تھا۔

وَأَنزَلَ اللهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا۔

وَمَا كُنتَ تَرْجُوا أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ۔ فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ.

اہلِ عرب میں کوئی ان تعلیمات کی خوبی پر داد دینے کی صلاحیت کوئی نہیں رکھتا تھا۔ اور اہل عجم میں سے کوئی فصاحت و بلاغتِ زبان کی داد نہیں دے سکتا۔ مجموعہ کمالات اللہ کی ذات ہے، اسی کا یہ کلام ہے، اس لئے اللہ اس کی داد بھی دے سکتا ہے اور وہی گواہی دیتا ہے کہ قرآن نہ محمدؐ کا کلام ہے اور کسی دوسرے کا ہو سکتا ہے۔

(لٰكِنِ اللهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ)

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي. هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ جب نزول وحی ہوتا ہے اور تم کوئی نئی آیت ان کافروں کو نہیں سناتے تو کہتے ہیں کہ کوئی آیت اپنے ہی طرف سے کیوں چھانٹ کر نہیں لائے اے محمدؐ۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں صرف اسی کا پابند ہوں جو میری تربیت کرنیوالے پروردگار کی جانب سے حکم دیا جاتا ہے۔ یہ قرآن تم سب کے پروردگار کی جانب سے آتا ہے۔ جس میں تمام سوجھ بوجھ کی باتیں ہیں۔ جو ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

بہر حال آنحضورؐ پر چالیس سال کی عمر کے بعد جب قرآن نازل ہونے لگا۔ خود تو خود دوسروں کی اصلاح کا فریضہ ذمہ لگا تو یکایک یہ بے مثل حکیم لاثانی مصلح، خاموش سوداگر، حیرت انگیز اخلاق و تمدن کا حامل، سیاست میں ماہر، زبردست مقنن، ایک بے نظیر منصف، لاجواب سپہ سالار، ماہر نظم و نسق یعنی اخلاق مجسمہ ہمدردی بنکر ظاہر ہوئے۔ الٰہیات کے اہم نظریات

بیان کرنے لگے حکمت و دانائی کی باتیں سنانے لگے۔ تاریخ اقوام واضح کرتے ہوئے عروج و زوال کے فلسفہ پر لیکچر دینے لگے۔ پچھلے مصلحین کے اقوال و اعمال پر تبصرے کرنے لگے۔ اخلاق و تہذیب و شائستگی کا درس دینے لگے سماجی اصلاح کی عملی تربیت دینے لگے۔ معاشرت و معاشیات کے اصول بتانے لگے ایک فرد کی زندگی کے اصول۔ اجتماعی زندگی کے قوانین۔ بین الاقوامی تعلقات کے ضوابط سکھانے لگے۔

وہی شخص جو کل تک خاموش سوداگر تھے۔ بڑے سپاہی بن گئے زبردست جنرل بن کر ظاہر ہوئے اور نو سال میں پورا ملک عرب فتح کر لیے۔ بہادری اور جنگ بازی کی ایسی مناسب تعلیم آپؐ نے دی کہ اس کی قوم تھوڑے عرصہ میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں قیصر و کسریٰ کو نیچا دکھا دیا۔

۲۳ سال کے مختصر سے عرصہ میں آپؐ نے اس قوم کو جو دنیا میں ہر اعتبار سے گئی گذری تھی، ایسی کایا پلٹ دی کہ انکا کردار قائم ہو گیا۔ ان کے اخلاق کو دنیا ماننے لگی۔ قبیلہ بندیوں سے اختلافات، رنگ و نسل سے ان کو نکال کر ایک تہذیب۔ ایک تمدن ایک قانون، ایک نظام حکومت کے تحت سب کو لاکر برادری کے رشتہ میں جوڑ دیا اور بارہ لاکھ مربع میل کی مکمل اصلاح کر دی۔

اپنے مشن کی اشاعت کے لئے نہ آپؐ کے پاس ریڈیو تھا نہ پریس اور نہ رسل و رسائل کے قومی ذرائع۔ نہ میدان جنگ میں سپاہیوں کی اکثریت ہوتی تھی۔ نہ سپاہیوں کے پاس حسب ضرورت ہتھیار۔ اور نہ ان مفلسوں کے پاس روپیہ ہی تھا کہ جس سے کام لیتے۔ تعلیمات کی صداقت، قوانین کی خوبی، اخلاقی جرأت، ہمت و بہادری درحقیقت بڑے ہتھیار تھے، جو کارفرما تھے، جس کے آگے عرب کے جاہلوں کے بھی سر نگوں ہو گئے۔ جس ملک میں دشمنی و عناد و رانت ملتی تھی۔ اس قوم کے قلوب ان تعلیمات کے ذریعہ الفت سے سرشار کر دیئے گئے۔ قرآن نے تعلیمات کے ان نتائج کا یوں اظہار فرمایا ہے کہ ولو انفقت ما فی الارض جَمِیْعًا ما الفت بَیْنَ قُلُوبھم و لکن اللہ الف بینھم۔

امی علیہ السلام کی امیت اور ان کے تعلیمات کی جامعیت اور خوبی اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ایک زبردست ہستی کا ہاتھ اس کائنات کے پیچھے کارفرما ہے جو امیؐ کی زبان سے قرآن جیسی کتاب الٰہیہ کی اشاعت اُمی علیہ السلام کی زبان سے کروا دیتی ہے۔

آپ کی امیت کے پیش نظر قرآن مجید پر غور کرو تو خود امیت ہی ہم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ایک معجزہ ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات اور اسکے زبردست کارنامے کو پیش نظر رکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماحول کی سابقہ حالت اور پھر مابعد کی حالت پر غور کرو اور اس ہمہ جہتی انقلاب پر غور کرو جو قرآن حکیم سے پیدا کیا تو قرآنِ عظیم بھی ایک مسلمہ معجزہ ہے اور جو انکشافات قرآن حکیم سے ہوئے اور ہوتے جا رہے ہیں، اس کے لحاظ سے بھی قرآن کریم رہتی دنیا کے لیے ایک زندہ معجزہ ہے۔

آج کی تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ قومیں بھٹک بھٹک کر قرآنی سانچہ پر جو اپنے قوانین کو ڈھال رہی ہیں اس کو جیتا جاگتا معجزہ ہی تو کہا جائے گا۔

آخر میں اُمی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام کا واسطہ دے کر پروردگار عالم رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں صحیح علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین

اَللّٰھُمَّ اھدنا الصِّراط المستقیم ۝

انسان کا مقام اور انجام

اسلامی فلسفہ کی روشنی میں

(از)
خلیل احمد صاحب ملک کامل الفقہ (نظامیہ) ایم۔او۔ایل
(استاذ جامعہ)

ساری تعریف اس خدائے قدیر وقیوم کو سزاوار ہے جس کا تخت عظمت وجلال ہمیشہ سے آراستہ ہے اور ہمیشہ آراستہ رہے گا۔ جس کی بارگاہ ذی عزت میں ان ہی افرادِ نیک نے جگہ پائی جنھوں نے اپنی حقیقت کو پہچانا اور اپنے انجام سے واقف ہوکر طریق ہدایت وراہ نجات کو اپنایا اور وہ افراد بد دھتکار دیئے گئے جو خود کے عرفان سے خالی اور معرفت رب سے عاری اور ارشاد قرآنی "اُولٰئِکَ ھُمْ کالانعام بل ھم اضل" کے مصداق حیوانات ونباتات کی طرح زندگی کے دن مکمل کئے اور گزر گئے۔

ہزاروں درود وسلام تمام انبیاء کرام ورسل عظام پر اور سرور کائینات خاتم النبیین رحمۃ اللعٰلمین حضور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کی ذات بابرکات نے گم کردہ راہ انسان کو طریق حق وراہ نجات بتلایا اور انسان کو اس کے اپنے حقیقی مقام وانجام سے واقف کروایا۔

ہزاروں رحمتیں نازل ہوں آپؐ کے آل واصحاب پر جنھوں نے انسان اور انسانیت کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔

آج میں آپ کے سامنے اسلام کے فرزند اور اسلامیات کے طالب علم کی حیثیت سے اسلامی فلسفہ کی روشنی میں انسان کے مقام اور انجام کے متعلق کچھ اپنے معلومات پیش کروں گا، تاکہ اسلامی فلسفہ کو سمجھنے اور اس [illegible] حقیقت پسندانہ غور وفکر کرنے کا موقع ملے۔ آیئے کہ ہم سب سے پہلے انسان کے متعلق ہی غور کریں اور اس کے مقام کو متعین کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

اگر ہم اس دنیا پر جس میں ہم رہتے بستے ہیں نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ اس میں ہزارہا انواع واقسام کی چیزیں نظر آتی ہیں اور ہر ایک کی نوعیت وجنسیت اور ان کی زندگی کے تقاضے الگ الگ اور مختلف نظر آتے ہیں۔ بعض مفسرین قرآن نے لکھا ہے کہ اس عالم میں جملہ اٹھارہ ہزار مخلوقات وموجودات ہیں اس دنیا میں ہزارہا موجودات ہونے کے متعلق ہمیں کسی برہان ودلیل کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ امر بدیہات ومشاہدات سے ہے۔ اگر ہم ان موجودات عالم پر مفکرانہ نظر ڈالیں اور ان کے حقائق وذاتیات اور مابہ الامتیاز خصوصیات پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ انسان ہی ایک ایسا موجود ہے جو سب پر برتری وفوقیت رکھتا ہے۔ ہم آج کل دیکھ رہے ہیں کہ زمین پر رہنے والا انسان آسمان پر اپنی فتوحات کے نشان ثبت کررہا ہے اور اس کی زمین کے موجودات

خواہ وہ کسی بھی قسم و جنس سے تعلق رکھتے ہوں آج تک انسان کے آگے دعویٰ فضیلت و فوقیت کرتے نہیں دیکھے گئے۔

موجودات عالم میں بہت سے ایسے بھی موجود ہیں جو انسان سے بعض چیزوں میں بڑھے ہوئے ہیں اور انسان اُن کا عشر عشیر بھی نہیں مثلاً طاقت و قوت کو لیجئے کہ شیر، چیتا، ببر وغیرہ درندے شجاعت و طاقت میں انسان سے کئی گنا زائد ہونے کے باوجود وہ آج تک کسی انسان کو اپنا مطیع نہ بنا سکے۔ اسی طرح دیگر حیوانات بھی ہیں جو باوجود قوت و طاقت جسم و جسامت وغیرہ میں انسان سے بڑھے ہوئے ہونے کے انسان ہی کے زیر نگیں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ انسان اور دیگر موجودات میں باعتبار فلسفہ کیا تفاوت و امتیاز ہے۔ آئیے کہ ہم اسی نکتہ پر غور کریں۔ ہم نے پہلے ہی اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ موجوداتِ عالم ایک ہی نوع و جنس سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ مختلف اجناس سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ہر جنس میں بھی مختلف انواع پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موجودات بالکل بے حس و حرکت ہیں یعنی آج سے کئی سال پہلے یا کئی ہزار سال پہلے وہ جس حالت پر تھے اور جہاں تھے آج بھی وہ اسی حالت پر اور وہیں ہیں تاریخ کی شہادت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وجہ یہ ہے کہ اس جنس میں از خود متغیر و متبدل ہونے کی کوئی فطری صلاحیت نہیں مثلاً پتھر پہاڑ وغیرہ اس قسم کی موجودات کو اصطلاح میں جمادات کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض موجودات ایسے ہیں، جو ہر وقت و ہر آن تغیر و تبدل کا لباس پہنتے رہتے ہیں اور نشو و نما سے دوچار ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی دو قسم کے موجودات ہیں۔ بعض وہ جو بڑھتے ہیں اور متغیر و متبدل ہوتے ہیں مگر ان میں احساس کا کچھ مادہ نہیں ہوتا اور نہ وہ متحرک بالارادہ ہوتے ہیں بلکہ وہ جہاں ہوتے ہیں، وہیں رہتے ہیں ان میں نقل مکان کی صلاحیت نہیں ہوتی اس قسم کے موجودات کو نباتات کہتے ہیں، مثلاً درخت پودے وغیرہ اور ان ہی میں دوسری قسم ایسے موجودات کی ہے جو متغیر و متبدل ہونے بڑھنے گھٹنے کے ساتھ ساتھ ان میں شعور و احساس بھی ہوتا ہے اور اپنے آپ سے جہاں چاہے جا سکتے ہیں اپنی حرکت آپ کرتے ہیں، اپنے ارادے سے چلتے پھرتے ہیں اس قسم کے موجودات کو حیوانات کہتے ہیں، چنانچہ حیوان کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"الحیوان جسم نامی حساس متحرک بالارادۃ" یعنی حیوان اس قسم موجود کو کہتے ہیں جس میں احساس اور بڑھنے والے جسم اور حرکت بالارادے کی صلاحیت ہو" اسی قسم حیوانات میں انسان بھی داخل ہے کیونکہ انسان کا بھی جسم بڑھنے والا ہے اور وہ متحرک بالارادہ بھی ہے۔ مضمون سابق کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ موجودات عالم تین زمروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک جمادات کہ جن میں حیات و شعور کا کچھ مادہ نہیں ہوتا۔ دوسرے نباتات کہ ان کا جسم نامی تو ہوتا ہے مگر وہ حساس و متحرک بالارادہ نہیں ہوتے، تیسرے حیوانات کہ جن کا جسم نامی بھی ہوتا ہے اور وہ حساس و متحرک بالارادہ بھی ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جمادات پر نباتات کو فضیلت و فوقیت ہو، کیونکہ وہ جمادات کے ساتھ، جسم میں مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ صفت نمو کی خصوصیت رکھتے ہیں اسی طرح جمادات و نباتات پر حیوانات کو فضیلت و فوقیت ہو کیونکہ حیوانات ان دونوں کے ساتھ جسم میں اور جسم نامی میں مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ احساس اور حرکت بالارادہ کی خوبی رکھتے ہیں۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہو گئی کہ حیوانات دیگر موجودات سے اعلیٰ و افضل ہیں۔ لیکن اس میں انسان کی کوئی انفرادی خوبی و خصوصیت ظاہر نہیں ہو سکتی کیونکہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح حیوان ہونے میں مساوی طور پر شریک ہے۔ اس حد تک فلسفۂ یونان و فلسفۂ اسلام دونوں متحد ہیں۔ اس لیے ہمیں ایک ایسی خصوصیت تلاش کرنی چاہیئے جو انسان کو دوسروں سے ممتاز کر دے اور ہم اس کے ذریعہ انسان اور دیگر حیوانات میں واضح فرق کر سکیں۔ فلسفۂ یونان انسان کو دیگر حیوانات میں نطق کی صفت کی وجہ سے ممتاز کرتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے اور دیگر حیوانات ناطق نہیں ہیں۔ فلسفۂ یونان اسی طرح ایک ایک صفت کو لیکر ہر نوع کو اس کے شریک الانواع سے ممیز کر دیتا ہے خواہ وہ صفت فضیلت کی حامل ہو یا نہ ہو چنانچہ وہ گھوڑے کو حیوان صاہل کہتا ہے یعنی ہنہنانے والا جانور ہے اسی طرح وہ گدھے کو حیوان ناہق کہتا ہے۔ یعنی بُری آواز سے چیخنے والا جانور۔ الغرض اسی طرح وہ ایک دوسرے کو ممیز کرتا ہے۔ یہ صفت امتیاز کا کام تو دیتی ہے لیکن افتخار کا باعث نہیں بن سکتی۔ اس لیے اگر انسان حیوانِ ناطق ہو جائے تو فلسفۂ اسلام اس کو چنداں اہمیت نہیں دیتا اور نہ اسے انسان کے لیے مابہ الافتخار سمجھتا ہے چنانچہ وہ ہر ناطق کو مکلف قرار نہیں دیتا فلسفۂ یونان کی رُو سے بچہ بھی حیوان ناطق ہے، بوڑھا جوان اور دیوانہ و پاگل سب ہی حیوانِ ناطق ہیں لیکن فلسفۂ اسلام میں وہ آدمی مکلف ہے جس میں عقل و شعور ہو اور وہ حدِ عقل و ادراک کو پہنچ گیا ہو یعنی وہ بالغ ہو عقل و شعور ہی ایک ایسی صفت ہے، جس سے دیگر حیوانات خالی و عاری ہیں، اسی وجہ سے وہ حیوانات باوجود طاقت قوت میں انسان سے بڑھے ہوئے ہونے کے مخاطب شریعت نہیں اور نہ وہ مکلف ہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حیوانات میں بھی شعور ہوتا ہے وہ اپنے نفع و نقصان کا احساس رکھتے ہیں اگر انہیں چارہ دیا جائے یا پانی نہ پلایا جائے تو چیختے ہیں اگر انہیں باندھا نہ جائے تو وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جاتے آتے ہیں اگر کوئی ہرن یا شکاری جانور جنگل میں اپنے دشمن کو دیکھ لے تو فوری اپنے تحفظ کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دیگر حیوانات میں انسان کی نسبت زیادہ قوی حواس ہیں۔ گھوڑا کئی میل دور کی چیز سونگھ لیتا ہے۔ وہ سیاہ و تاریک رات میں بغیر روشنی کے سفر کرتے ہیں اور راستہ نہیں بھٹکتے اسی طرح وہ اپنے بچوں کو انسان سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ اور ان کے بچے انسان کے بچوں سے پہلے شعور میں آتے ہیں۔

الغرض یہ اور اس قسم کی بہت سی چیزیں انسان اور حیوان میں مشترک ہیں لیکن فلسفۂ اسلام کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ وہ بدیہات کا منکر ہے یا وہ انسان میں ان چیزوں کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فلسفۂ اسلام انسان کو دیگر حیوانات کے مقابل نطق سے ممیز و منفرد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے صفتِ عقل کی وجہ سے سب سے افضل و اعلیٰ قرار دیتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ عقل و شعور کا کچھ مادہ دیگر حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ فلسفۂ اسلام اس کا منکر نہیں بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ دیگر حیوانات کا شعور، شعورِ تام نہیں اور نہ ان میں عقل و ادراک کی وہ تمام خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ہم انسان کو عاقل کہہ رہے ہیں۔

[دیگر حیوانات میں حواس ظاہری یعنی سمع، بصر، لمس، شم، ذوق کے علاوہ حواس باطنی بھی ہیں جن سے دیگر حیوانات مطلقاً عاری ہیں ان حواس باطنی کا کچھ شائبہ تک ان میں نہیں حواس باطنی یعنی حس مشترک۔ خیال۔ وہم

حافظہ۔ منفرد۔

حسِ مشترک۔ وہ قوت برتر ہے جو دماغ کے تجاویف ثلثہ کے تجویف اول کے مقدم میں پائی جاتی ہے۔

خیال۔ وہ قوت برتر ہے جو دماغ کے تجویف اول کے مؤخر میں پائی جاتی ہے۔

وہم: وہ قوت مرتبہ ہے جو دماغی تجویف اوسط کے آخر میں پائی جاتی ہے۔

حافظہ: وہ قوت منفرد ہے جو دماغی تجویف آخر کے ابتداء میں پائی جاتی ہے۔

منفرد:۔ وہ قوت مرتبہ ہے جو دماغی اوسط کے بطن میں موجود ہے۔

کی وجہ سے عقل تام اور شعور تمام ہوتا ہے۔ ورنہ حواس ظاہری ایک بچہ اور دیوانہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔]

نیز حیوانات میں ادراک کا مادہ ہوتا ضرور ہے لیکن ان کے حواس مکمل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ادراک تصورات وتصدیقات سے خالی ہے اور ان کا علم جزئیات وکلیات سے عاری ہے ان میں قیاس واجتہاد کا مادہ نہیں وہ نامعلوم کو معلوم کے ذریعہ معلوم نہیں کر سکتے حتی کہ وہ اپنی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ دیگر حیوانات میں عقل وشعور کا جو شبہ ظاہر کیا گیا وہ کسی صورت میں اس درجہ کو نہیں پہنچتا کہ ہم اس کی وجہ سے انہیں عاقل کہیں۔

چنانچہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسان کی طرح دیگر حیوانات بھی حرکت کرتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن خود انہیں پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں اور کب آئیں گے۔ اور وہ جس طرف جا رہے ہیں، وہ کونسی سمت ہے اور ان کی منزل کیا ہوگی اس کے قطع نظر اگر ان میں عقل وشعور ہوتا تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ سب غالب رہے اور اس کے ماسوا چیزیں اس کے زیرنگیں ومطیع ہوں دیگر حیوانات میں دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک چیز بھی نہیں پائی جاتی۔ ان میں اتنا بھی شعور نہیں ہوتا کہ وہ کچھ بڑے ہونے کے بعد اپنے ماں باپ کو پہچان سکیں۔ ان تمام نقائص کو دیکھتے ہوئے کوئی انسان یہ کہہ نہیں سکتا کہ دیگر حیوانات میں بھی عقل وشعور کا مادہ ہے۔ اگر کوئی کہے تو ہم یہی کہیں گے کہ وہ فلسفۂ یونان کی رو سے انسان ہے اور فلسفۂ اسلام کی رو سے غیر مکلف۔

اب تک میں نے صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودات عالم میں صرف حیوانات کو فوقیت وفضیلت ہے اور ان حیوانات میں عقل وشعور کی وجہ سے انسان کو فضیلت وبرتری حاصل ہے لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عقل صرف انسان ہی کو ملی ہے یا اور بھی موجودات اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز ہوئے ہیں۔ اعتقادات ومذاہب کی دنیا میں یہ بات ثابت ہے کہ موجوداتِ عالم میں ملائکہ یعنی فرشتے اور جنات بھی شامل ہیں فلسفۂ اسلام بھی اسی عقیدہ کا حامل ہے اسلام میں ملائکہ کا یہ مقام ہے کہ ان پر ایمان لائے بغیر کوئی انسان حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی فلسفۂ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ فرشتے اور جنات بھی عقل وشعور رکھتے ہیں چنانچہ عربی نحویین واسلامی فلاسفہ ومتکلمین موجودات کو دو طرح تقسیم کئے ہیں۔ ایک ذوی العقول یعنی عقل وشعور والے دوسرے غیر ذوی العقول یعنی بے عقل وشعور اب یہ چیز حل طلب رہتی ہے کہ یہ تینوں موجودات آپس میں مساوی درجہ رکھتے ہیں یا ایک دوسرے پر فوقیت وفضیلت رکھتے ہیں جبکہ عقل ان تینوں میں برابری کے ساتھ مشترک ہے۔

فلسفۂ اسلام یہی کہتا ہے کہ یہ تینوں موجودات بہ حیثیت ذوی العقول ہونے کے مساوی و برابر ہیں اُن کا اللہ کے پاس ایک دوسرے سے مکرم و معظم اور مقبول ہونا دوسری نوعیتوں سے ہے۔ فرشتے ایک نورانی مخلوق ہے جو ہمیشہ عبادت الٰہی و طاعت رب میں مشغول و منہمک ہیں۔ وہ اپنی پیدائش سے آج تک نافرمانی نہیں کئے اور نہ وہ قیامت تک نافرمانی کریں گے۔ کیونکہ نور کا اقتضاء یہی ہے کہ وہ کثافت و خباثت سے دور رہے اور حسن و لطافت کو اپنائے مختصر یہ کہ ان میں گناہ کی صلاحیت ہی نہیں اسلیے وہ کبھی گناہ نہیں کرتے، جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

لا یعصون اللہ ما أمرهم یفعلون ما یؤمرون۔

یعنے وہ فرشتے انہیں خدا جس چیز کا حکم دے اسکی نافرمانی نہیں کرتے۔ پس یہ فرشتے انسان اور جنات کے ساتھ عقل میں مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ انفرادیت بھی رکھتے ہیں یعنی وہ تکلیفات شرعیہ سے بالاتر ہیں کیونکہ ان کے پاس حسن و لطافت اور اطاعت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اس کے برخلاف انسان اور جنات ایسے نہیں ان کے سامنے خیر و شر دونوں راستے رکھ دیئے گئے اور ان میں فطرۃً و تخلیقاً دونوں راستوں کو اپنانے کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ (جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے، وھدینا النجدین یعنے ہم نے اسے دونوں راستے بتلادیئے) انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور اس میں دو مادے ہیں ایک حیوانیت کا اور دوسرا عقل، حیوانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خواہشات کی اتباع کرے اور ہمیشہ نفس بے جا کا غلام بنا رہے جیسے کہ دیگر حیوانات کرتے ہیں لیکن عقل کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اس کو راستہ کی بے اعتدالی سے ہٹائے اور اسے صراط مستقیم بتلائے۔ اسی وجہ سے انسان کو حرام و حلال، جائز و ناجائز کی ابتلاء میں ڈالا گیا۔ اسی طرح جنات ہیں وہ ایک آتشی مخلوق ہے، آتش کا اقتضاء یہی ہے کہ وہ شر و فساد کرے حق و باطل کے امتیاز کو ختم کردے لیکن عقل ان چیزوں سے روکتی ہے اور راہِ حق کی رہنمائی کرتی ہے اسی طرح کی تشریح مشہور اسلامی فلسفی حضرت امام غزالی نے اپنی کتاب میں کی ہے۔ گرچیکہ میں تشریح و توضیح میں اپنے عنوان سے کچھ ہٹ گیا ہوں لیکن مقصد سے دور نہیں ہوا ہیں صرف یہ بتلانا چاہ رہا تھا کہ انسان کو عقل ہی کی وجہ سے خدا نے مکلف قرار دیا ہے اور اُسی کی وجہ سے وہ دیگر موجودات پر فوقیت رکھتا ہے لیکن فرشتوں اور جنات پر فضیلت پانے کے اسباب دوسرے ہیں ان میں کا سب سے اہم سبب فضل الٰہی و مرضی مولیٰ ہے۔ فلسفۂ اسلام کے لحاظ سے خدا قادر مطلق ہے وہ اپنے افعال میں مختار کل ہے۔ کسی کو اس کے احکام و افعال و تصرفات میں چوں و چرا کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اپنی ہی مملوکہ و مخلوقہ چیزوں میں کر رہا ہے۔ اس لیے خدا نے انسان کو اپنی تمام مخلوقات پر فائق المقام کر دیا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، "بے شک کہ ہم نے انسان کو بہترین بناوٹ میں پیدا کیا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا" لقد کرمنا بنی آدم، یقیناً ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا۔ وسخر لکم ما فی السموات والارض جمیعًا منہ

فلسفۂ اسلام میں یہ بات ثابت ہے کہ اس سرزمین پر انسان سے پہلے جنات آباد تھے۔ اور ان میں بھی انبیاء کرام تشریف لاتے تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو خلق صالح بنانے کے بجائے قتل و غارت گری، فتنہ و فساد معصیت و نافرمانی میں زیادہ توجہ کی اور مقصد تخلیق سے ہمیشہ گریزاں ہے

چنانچہ خدا نے جب یہ اعلان فرمایا "اِنّی جاعل فی الارض خلیفۃ" یعنی میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا " اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدما" ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک" یعنی یا خداوندا کیا زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون ریزی کرے گا جبکہ ہم تیری ہی پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری ہی تقدیس کرتے ہیں۔ فلاسفہ اسلام و مفسرین قرآن نے لکھا ہے کہ فرشتوں نے انسان کے وجود میں آنے سے پیشتر اور اس سے ان واقعات کے واقع ہونے سے قبل اس بنا پر ان اندیشوں کا اظہار کیا کہ وہ انسان سے پہلے کی مخلوق ارضی کے واقعات دیکھ چکے تھے۔ فلاسفہ اسلام اس آیت کریمہ سے دو باتیں ثابت کرتے ہیں۔ ایک جنات کا غیر صالح ہونا دوسری خلافت ارضی کا مقام فرشتوں کے مقام سے اونچا و اعلیٰ ہونا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فرشتوں کو اعتراض کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ انسان کا مقام تمام مخلوقات سے اونچا و اعلیٰ ہے اسی وجہ سے فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کروا کر انسان کی عظمت کو ظاہر کیا گیا اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو مردود ابدی قرار دیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے " فسجد الملائکۃ کلھم اجمعون۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: فسجدوا الا ابلیس ابی واستکبر وکان من الکافرین۔ اور ایک جگہ ارشاد ہے فقعوا لہٗ ساجدین:

فلسفۂ اسلام انسان کا مقام اسی حد تک متعین کر کے خاموش نہیں رہ جاتا کہ وہ موجودات عالم میں سے ایک موجود ہے اور دیگر موجودات پر اس کو عقل کی وجہ سے فضیلت و فوقیت ہے بلکہ فلسفۂ اسلام انسان کو اس کی عقل کی وجہ سے جھنجوڑتا تھا اور اس سے سوال کرتا ہے کہ بتلاؤ تم ان سب خوبیوں کے حامل اور سب سے افضل ہونے کے باوجود کیا تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم اپنے آپ مالک ہو خود مختار ہو کیا تم اپنی زندگی کو بغیر کسی غیبی سہارے کے مکمل طور سے گزار سکتے ہو کیا تم اپنی ضروریات کے خالق ہو یا کم از کم قادر مطلق ہو۔ کیا تم اس دنیا میں آنے سے پہلے اس دنیا کو جانتے تھے کیا تم کو اس بات کا علم تھا کہ تم اس دنیا میں آؤ گے۔ خیر اب بتلاؤ کہ تم اس دنیا میں کب تک رہو گے تمہاری موت کب آئے گی اور کہاں آئے گی اور کیسے آئے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ لاتدری نفس بای ارض تموت یعنی کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کونسی زمین میں مرنے والا ہے۔

کیا تم جانتے ہو کہ کل کیا ہونے والا ہے اور تم کیا کرنے والے ہو، قرآن کہتا ہے۔" لاتدری نفس ماذا تکسب غداً" یعنی کوئی نفس اس بات کو نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرنے والا ہے۔ الغرض اسلام انسان سے ان ہی چیزوں کے متعلق سوال کرتا ہے جنھیں وہ رات دن دیکھتا ہے اور انہیں استعمال کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عقل تمام و شعور تمام رکھنے والا انسان یہی جواب دے گا میں کچھ نہیں جانتا میں کسی چیز پر قادر نہیں ہوں اگر کل بارش نہ ہو تو مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں اسے لاسکوں یا اگر طوفان و بادباراں سے میری زندگی خطرے میں آجائے تو تب بھی مجھ میں طاقت مدافعت نہیں اگر کچھ دیر کے لئے ہوا روک لی جائے تو میری زندگی بے بس ہو کر ختم ہو جائے گی یہ تمام چیزیں میرے علم کے بغیر اور میرے اختیار و اقتدار سے ہٹ کر ہو رہی ہیں میں کسی چیز کا مالک و خالق نہیں ہوں کیونکہ میں خود مخلوق و مجبور ہوں میں نہ تھا اب ہوں مستقبل میں نہ رہوں گا میری زندگی کے یہ تمام انقلابات میری مرضی سے نہیں ہوتے۔ تب فلسفۂ اسلام پھر سوال کرتا ہے۔ بتلاؤ کیا یہ سب از خود ہو رہے ہیں یا کسی

کے کرنے سے ہو رہے ہیں ۔ انسان عاقل ضرور یہی کہے گا کہ یقیناً یہ کسی غیبی ہستی کی کرشمہ سازی ہے ۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں میرے حیطۂ اقتدار میں ہیں اور یہی سب سے اعلیٰ و افضل ہیں۔ مجھے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ میں سب کا خالق ہوں مالک و رزاق ہوں۔ لیکن میں نے عقل سلیم و شعور صحیح سے اپنی حقیقت کا جائزہ لیا اور یہ جان لیا کہ میں خود مخلوق ہوں لہٰذا ساری دنیا اور اس کی تمام چیزیں مخلوق ہیں اور ان سب کا خالق ایک ہے اگر ان سب کا خالق ایک نہ ہوتا کئی ہوتے تو فلسفۂ اسلام پھر سوال کرتا ہے کہ بتلاؤ ان دونوں میں غالب اور کون مغلوب ہے ۔ اگر کوئی مغلوب ہے تو وہ خدا نہیں، اگر دونوں مساوی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج و مجبور اور ایک دوسرے سے خائف ہیں ایسی بھی کسی صورت میں کوئی بھی خدا نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا ماننا ہو گا کہ ان تمام کا خالق و رزاق ایک ہے اور وہی سب کا مالک و مختار ہے ۔ فلسفہ اسلام وحدانیت رب کو برہان تمانع سے ثابت کرتا ہے ۔ ارشاد خداوندی ہے " لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا "، یعنی اگر زمین و آسمان میں ایک خدا کے سوا کئی خدا ہوتے تو یہ زمین و آسمان فساد زدہ ہو جاتے ۔

الغرض فلسفۂ اسلام کی غرض صرف یہی ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور خود کی حقیقت و دنیا کی ماہیت میں غور و فکر کر کے اپنے مقام مخلوقیت و عبدیت کو پہچان لے ۔ قرآن کہتا ہے ۔ و فی انفسکم افلا تبصرون ۔ یعنی اپنے آپ میں کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ۔ اسی بناء پر مشہور اسلامی فلسفی حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہ یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا یعنی خود کی بے بسی و مخلوقیت کا عرفان کسی کی عظمت و خالقیت کے عرفان کو متلزم ہے ۔

اسی وجہ سے فقہ حنفی کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی یا کسی ایسے مقام میں جا گزیں ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ پر اور دنیا پر غور کر کے عقل کے ذریعہ وحدانیت الٰہ کا قائل ہو ۔ ان تمام سوالات اور دعوت غور و فکر سے فلسفۂ اسلام کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان اپنے انجام سے آگاہ ہو اور اسے بہتر و خوب تر بنانے کی راہ تلاش کرے ۔ اسلام کا بنیادی نظریہ یہی ہے کہ بہتر انجام بہتر آدمی کے لیے اور برا انجام برے آدمی کے لیے ۔ اسلام کے پاس اچھائی اور برائی کا معیار ایمان ہے ۔ لہٰذا اسلامی فلسفہ یہی کہتا ہے کہ مومنین و مخلصین کا انجام ہی اچھا ہو گا اور یہی لوگ فائز المرام ہونگے ۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے ۔ :

" والعصر ان الانسان لفی خسر
الا الذین امنوا و عملوا
الصالحات و تواصوا بالحق و
تواصوا بالصبر "

یعنی خدائے پاک زمانے کی قسم کھا کر کہہ رہا ہے، زمانہ کی قسم تمام انسان نقصان و خسارہ میں بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق و صبر کی وصیت و نصیحت کی ۔

اسلامی فلسفہ کی رو سے انسان کا انجام مرنے کے بعد ہو گا ۔ اسلامی فلسفہ اس دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزا قرار دیتا ہے ۔ بہتر انجام سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے خالق کو راضی کر لے اور اسے وہاں اس کا دیدار نصیب ہو اور وہ خدا کی نعمتوں میں سرشار رہے، بہتر انجام سے مراد یہ نہیں کہ انسان دنیا میں خوب مال و دولت جمع کرے اور خوشحالی

کی زندگی بسر کرے اور دنیوی تعیشات کا مرکز بنا رہے۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انسان کے بہتر انجام کے لیے ایمان ہی کافی ہے یا اعمال صالحہ بھی ضروری ہے۔

اسلام دو چیزوں سے مرکب ہے

ایک عقیدہ، دوسرے اعمال۔ ان دونوں میں نجات کے معیار کی کلیدی حیثیت عقیدہ کو حاصل ہے۔ یعنی انسان بغیر عقائد کی تکمیل کے دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا۔ خواہ وہ کتنے ہی اچھے کام کرے، اعمال صالحہ ایمان کی زینت ہیں۔ بغیر ایمان کے اعمال صالحہ کا کوئی وزن نہیں اسی طرح اگر کوئی شخص ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرے تو یقیناً اس کا انجام بہتر ہوگا اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ایمان لائے اور اعمال صالحہ نہ کرے اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہو تو فلسفہ اسلام اس کی نجات کی ضمانت دیتا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ رہا۔ اعمال غیر صالحہ کا سوال اسلام نے پہلے ہی ایمان اور اعمال کو علٰحدہ قرار دیا ہے اعمال غیر صالحہ کے متعلق اسلام کا فلسفہ یہی کہتا ہے، خدا غفار ہے چاہے تو اسے بخش دے یا اسے سزا دے۔ وہ لائق سزا ضرور ہے لیکن خدا کی رحمت اسے بھی معاف کرسکتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔

جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جو قرآن حکیم میں درج ہے۔: ان تعذبهم فانهم عبادك وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم۔ یعنی اے خدا تو ان لوگوں کو جنھوں نے میرے غیاب میں مجھے معبود بنا لیا ہے۔ عذاب دے تو بے شک یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انھیں معاف فرمادے تو بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی فلسفہ کی رو سے انسان تمام مخلوقات و موجودات سے اعلیٰ و افضل ہے اور تمام انسان بہ حیثیت انسان برابر ہیں مگر جو انسان اپنے مالک کو پہچانتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں وہ اللہ کے وفادار بندے ہیں۔ اور جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور اسی وجہ سے اسکے احکام پر نہیں چلتے وہ اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں۔

لہٰذا بلحاظ انجام مسلمان کو فائز المرام اور غیر مسلموں کو اصحاب نقصان و خسران قرار دیتا ہے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ

رباعی

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

اقبال

حافظ قاضی محمد بشیر الزماں
متعلم مولوی فاضل جامعہ نظامیہ

دورِ حاضر میں مذہب اور سائنس

اٹھارھویں انیسویں صدی میں سائنس کی ترقیات سے مرعوب ہوکر بہت سے مغرب زدہ لوگ مذہب کے بارے میں یہ کہنے لگے کہ مذہب ایک بے منفعت سرمایہ ہے۔ سائنس کے مقابل مذہب بری طرح شکست کھاچکا ہے۔ مغرب کے تقریباً سبھی ماہرین سماجیات اور علمائے طبعیات نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار کھلم کھلا شروع کر دیا۔ یورپ کے مشہور فریالوجسٹ فرائڈ کو میں مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں، جو واضح طور پر یہ بات پیش کر رہا ہے کہ اس دور کی ترقی میں مذہب کی طرف سے ہر وکالت بے سود اور بیکار ہے اس لئے کہ انسانی زندگانی تین ممتاز ادوار سے گذری ہے، ابتداءً عقائد باطلہ، پھر مذہب، مذہب کے بعد سائنس کا دور ہے اس لئے اب صرف سائنس کی حکمرانی اور اس کی برتری کا دور ہے۔

متذکرہ خیالات کے اظہار کی بناء پر یورپ کے سائنسداں مخالف مذہب زندگی گذارنے کی سوچنے لگے اور مذہب کی مخالفت سائنس کا بنیادی مقصد بن گیا۔ اس اختلاف کا حقیقی سبب وہ تلخ بختیاں تھیں جو یورپ کے پادریوں اور سائنس دانوں کے مابین عرصہ تک جاری رہیں اور ان کے نتائج بد سے یورپ پوری طرح دوچار ہوا یعنی مذہب کے مخالفین یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ انہیں لازمی طور پر اپنی راہ بدلنی ہوگی؛ اس لئے کہ چرچ کے خیالات رجعت پسندانہ اور باطل پرستانہ ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ مذہب اب سائنس کے لئے کرسی خالی کر دے تاکہ انسانیت آگے بڑھ سکے اور ترقی کی راہ پر قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ مذہب اور سائنس کے اس ناگوار تصادم کے موقع پر لوگوں نے یورپ کی مخصوص طرز زندگی اور اسلام کی سادہ پاکیزہ اندازِ رہائش میں فرق کرنے کی کوئی سعی نہ کی، بلکہ مذہب کی مقدس روایات کو جو انہیں اسلاف سے ترکہ میں ملی تھیں قطعاً صرف نظر کرلیا۔ اب کیا تھا یورپ کی کورانہ تقلید کی وبا اتنی تیزی سے چلی کہ اس نے اسلام کی پاکیزہ سلطنت کے تار و پود بکھیر دیئے اور تجدد پسندی نے لوگوں میں ایسا رجحان پیدا کر دیا کہ ہر شخص کو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ ترقی کی راہ صرف وہی ہے جو ہمیں یورپ کی متسلط اقوام نے دکھلائی ہے۔ چنانچہ ناسمجھ مسلمان بھی یورپ کی طرح اسلام کو خیرباد کہنے لگے اب ان مقلدین میں ذہنی پستی اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اس افتاد اور ردِّ عمل کا تصور بھی اپنی آبلہ فریبی کی وجہ سے کرنے کے لائق نہیں رہ سکے پھر اپنی پستی و ذلت کا خطرہ، یہ تو بڑے دور کی بات تھی، پھر بھی آنکھ بند کر کے تقلید یورپ کا رجحان یکساں طور پر عام نہ تھا۔ سبھی اس میں مبتلا نہ تھے بلکہ ممتاز اہلِ علم کی ایک

ٹولی مذہب کو عزت کی نظر سے اب بھی دیکھتی رہی اور کوئی ایسا کام جس سے مذہب کی کھلم کھلا اہانت ہو عمل میں نہیں لاتی تھی۔

یہی نہیں بلکہ بہت سے روشن ضمیر نفوس یہاں تک دیکھنے میں آئے کہ انھوں نے یورپ کی بے خدا مادیت سے نہ صرف اپنے آپ کو علیحدہ رکھا بلکہ انھوں نے کھلے خزانہ یہ اعلان کیا اور اس اعلان میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی کہ مذہب انسان کی طبعی ضروریات کی کفالت میں اسی طرح پیش پیش ہے، جس طرح وہ انسان کی ذہنی تربیت میں اہم ترین مقام رکھتا ہے، اُن علماء کے روشن ضمیر میں سرِ فہرست مسٹر جیمس جینس (Jeams Jenes) مشہور ماہر فلکیات ہیں جن کی ابتدائی علمی زندگی انکارِ وجود باری سے منصۂ شہود پر آئی مگر انتہا اپنی تحقیق کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سائنس اپنی مبادیات سے لیکر اعلیٰ ترین مقاصد تک بغیر خدا کی قوت پر یقین رکھے ہوئے کسی ادنیٰ منزل اور معمولی نتائج تک بھی نہیں پہنچ سکی۔

مشہور عالم سماجیات جیمس برج (Jems Bird) نے اسلام کو عصری تقاضہ کے مطابق اعلیٰ ترین روحانی و جسمانی مرکب قرار دیا ہے جس کے بغیر زندگی چیستاں بنکے رہ جاتی ہے۔

انگلستان کے مشہور ترین اہلِ قلم مسٹر سومرسٹ میگھم (Somerst Magham.) مذہب کی طرف یورپ کو پوری طرح متوجہ کر رہا ہے اور اس نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ یورپ دورِ حاضر میں قدیم دور کے عظیم خدا کو چھوڑ کر سائنس جیسے بے بود خدا کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے ؎

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
اور خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائیگی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ
ہاں بچائے رکھیو اکبر اس سے اپنے آپ کو

عصرِ حاضر کا مانا ہوا خدا "سائنس" نہایت درجہ ناپائدار متلون المزاج، ناقابلِ اعتبار ثابت ہو چکا ہے۔ کل جن باتوں کی تکذیب سائنس کر چکی ہے آج اُس کا اثبات کر رہی ہے کبھی جسے ناپائدار بنا چکی ہے۔ اب اُسے پائدار اور مستقل سمجھا رہی ہے خود ہم بھی اپنی آنکھوں سے سائنس کے ان مقلدین کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ایک ابدی اضطراب سے دوچار ہیں انکے دل سکون کے بجائے بے سکونی کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں ان کی یہ بے چینی فطری ہے، بھلا کون کسی متلون المزاج خدا کا بندہ بن کر پُرسکون زندگی گذار سکتا ہے۔ ہرگز نہیں یہ پائدار اضطراب اور ابدی بے چینی جس کے مزے عصرِ حاضر کا یورپ بری طرح چکھ رہا ہے خود اُس کی فطرت و ذہنی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ آج یہ پژمردگی یورپ میں عام وبا کی طرح پھیل چکی ہے۔

موجودہ دور میں سائنس کی کورانہ پرستش سے ایک اور خرابی سامنے آرہی ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے ذہن سے کسی حکمرانہ دست برد رکھنے والی قوت کا تصور ہی مٹتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے مسلسل تصادم اور پیہم مزاحمت کی صورت سائنس اپنی متضاد قوتوں کے ساتھ جاری کئے ہوئے ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے اور معاشی اور سیاسی نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اور حکومت کے تعلقات بھی اس تبدیلی و تغیر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح سائنسی حقائق بھی تغیر پذیر ہیں۔ سائنس کی اُن آویزشوں سے ان حادثات میں آدمی کس طرح نجات پائے اور اس ابدی بے اطمینانی سے خلاصی کی کیا صورت اختیار کر سکتا ہے جبکہ سائنس کی گہری تاریکی نے دور سے دور تک اندھیرا پھیلا رکھا ہے۔ پھر ایسی صورت میں کہ سائنس سوا انسان کے سامنے کوئی دوسری عظیم طاقت ہی نہ ہو۔ جسے مشکلات کے وقت پکارا جاسکے اور جس کی اعانت کی بدولت سکون تک رسائی ہو سکے زندگی

اس نامراد کش مکش سے چھوٹ جائے۔

سچ بات یہ ہے کہ دنیا میں امن اور پائیدار سکون مذہب اور صرف مذہب ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو انسان میں خیر کی جوت جگاتا ہے۔ سینہ زور اور طاغوتی طاقتوں کے سامنے ایک عظیم دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور خالق کی خوشنودی حاصل کرنے میں مدد کرتا ہے۔

انسان باری تعالیٰ کی قوت کی بالادستی تسلیم کر کے ایک پائیدار سکون کا اظہار کرتا ہے کہ اس سے آنے والی زندگی کے انعامات حاصل کر سکے۔ آج یہ سوال بہت تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ کیا انسان کے اندر امن و آشتی کی طلب کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔

آپ خود سوچئے کہ آپ کی جھوٹی خواہشات اور اندھے جذبات جو زندگی کے ہر موڑ پر آپ کو ملتے ہیں ان کا محبت، صداقت اور روحانیت کی راہ میں بھوکے رہ کر زندگی گذارنے سے کیا تعلق ہے۔

ایک تنگ ایام و تنگ عیش زندگی کے مقابلہ میں جو اسی دنیا تک محدود ہے اسلام آئندہ کی خوش ایام و خوش عیش زندگی اور اُس کی کامرانیوں کو پسند کرتا ہے۔ جھوٹی خواہشات اور غلط جذبات پر حبِ الٰہی کی قدغن لگی رہتی ہے۔ یہی حقیقی رہنمائی اور سچی توانائی ہے جو انسان کو مضبوط اور توانا بنا دیتی ہے۔ اگر خدا و رسولؐ کی اس درجہ غالب محبت اُسے پاس نہیں ہے ایک ایسا شخص جو اپنی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کی تکمیل میں منہمک ہو، ممکن ہے وہ زندگی کو غلط زاویے سے دیکھ رہا ہو اور یہ سوچ رہا ہو کہ وہ زندگی کا لطف دوسروں کے مقابل زیادہ حاصل کر رہا ہے لیکن وہ بہت جلد اس حقیقت تک پہنچ جائیگا کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا جس شہرت کے پیچھے میں نے خود کو تباہ کر دیا وہ سراب سے کم نہیں ہے اور بہت جلد وہ اس عیش کوش زندگی سے متنفر ہو جائے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو یقین کیجئے کہ وہ ایک غیر فانی بے چینی اور ابدی اضطراب سے ہمیشہ دوچار رہے گا۔ اس لئے کہ حیوانی خواہشات، سفلی جذبات جب ایک مرتبہ بے قابو ہو جاتے ہیں تو پھر اُن کو لگام لگانا انہیں اپنے قبضہ میں لانا دشوار ہو جاتا ہے، بلکہ وہ اور تیز تر ہو جاتے ہیں اور انسان کو بہیمیت کے اس سطح تک گرا دیتے ہیں کہ بس کی ساری جدوجہد صرف ایک مرکز شہوت پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ شہوانی مسرتوں کی تکمیل چاہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیر کاروں کو حیوانی خواہشات کے ترک کرنے کی سب سے زیادہ ہدایت کرتا ہے۔ اور اس کا زندگی کی اس کمزوری کے دور کرنے پر سب سے زیادہ زور ہے اور اسی وجہ سے وہ متبعین اسلام کو راہبانہ زندگی بسر کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام زندگی کے صرف حسین پہلو ہی کو اختیار کرنے کی ترغیب نہیں دلاتا ہے بلکہ وہ اُن دونوں کے درمیان کی راہ اختیار کرتا ہے تاکہ اس افراط و تفریط سے انسان نکل کر اعتدال کی پُرسکون منزل میں آرام کر سکے۔

بہرحال اس ساری تگ و دو کا مقصد انسان کی فلاح و بہبود ہے، انسان، انسان کی خدمت کیلئے ہے۔ اس کا ہر کام کسی کو تباہ کرنا کسی پر حکمرانی کرنا نہیں ہے، وہ آدمی کو آدمی کا غلام بنانا نہیں چاہتا وہ کسی کو برتر اور کسی کو کمتر رکھنا نہیں چاہتا۔ اسلام انسان کی نجی زندگی کو اعلیٰ برتر صاف و نمایاں بنانے کے تمام ذرائع اختیار کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ ہمت افزائی کرتا ہے۔ مگر اجتماعی زندگی اس کی نجی زندگی کی پیش رفت پر ایسی پابندیاں لگاتا ہے کہ اُس کے ہوتے ہوئے سوسائٹی کا کوئی فرد ترقی سے بلا کم و کاست متمتع ہو سکے۔ اسلام نے تمدن کے ایسے اعلیٰ اصول رکھے ہیں کہ افراد اور سوسائٹی دونوں یکساں

طور پر ترقی کی راہ طے کر سکیں۔ نہ افراد مجروح ہوں نہ سوسائٹی ماؤف، جو لوگ اسلام کو بے وقت کی راگنی یا ایسا سکہ کہتے ہیں جس کا چلن بازار سے اٹھ چکا ہے، وہ شاید یہ نہیں سوچتے کہ ہم یہ بات کہاں سے کہہ رہے ہیں۔ دراصل انہیں اسلام کے حقیقی کردار سے جو اسلام نے انسانیت کیلئے پیش کیا ہے، قطعی واقفیت نہیں ہو سکی، سرمایہ پرستی کے دلالوں نے انہیں تاریخ کے کتابوں میں اس طرح مسخ کر کے پیش کیا ہے کہ جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات محض بت پرستی کے قلع قمع کے بعد خدائے واحد کی پرستش کیلئے وضع ہوئی تھیں اس لیے کہ عرب بت پرستی کی وجہ سے مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے تھے اسلام نے آکر انہیں متحد کیا ان میں قوت بھر دی انہیں سنگین دیوار بنا کر کھڑا کر دیا جس کا نتیجہ آپکے سامنے ہے، آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اسلام کے سلطنت کے حدود پورے پہنائے عالم میں پھیل گئی۔ تبلیغ دین بھی اسلام کی روح ہے جو لوگوں کے دلوں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ اسلام دنیا کے تاریخ کا ایک زندہ مشن ہے جو اپنے آغاز سے اسی انداز میں کامیاب ہے، بت پرستی کا اسلامی دنیا میں دور تک پتہ نہیں ٹولیوں میں بٹی ہوئی قوم ایک عظیم قومیت میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ لوگوں نے اپنے تشخیص اور قوموں نے اپنے انفرادیت کے بت کو اس عظیم قومیت کے سامنے ریزہ ریزہ کر دیا۔

آج کا تمدن ترقی کی جس [illegible] پہنچ چکا ہے وہ بالکل ظاہر ہے لیکن آج بھی یورپ کے لوگ اور [illegible] تہذیب کے دلدادہ خود اپنی جہالت کا ماتم کر رہے ہیں۔ انہیں اسلام اور اسلام کی انسانی زندگی کو کامیاب بنانے [illegible] مشن کے سلسلے میں کوئی ادنیٰ معلومات نہیں ہے۔

وہ لوگ جو اسلام کو صرف [illegible] کی عینک سے دیکھتے ہیں وہ اگر اسلام کو نورانی عینک سے دیکھیں تو اسلام کا نظام اُن کے سامنے تاریکیوں کے پردوں کو چاک [illegible] ہوئے دین حق کی دعوت دیتا ہوا نظر آئے گا اور یہ واضح ہو [illegible] کہ اسلام کسی ترقی کے لیے مانع اور حائل نہیں ہے بلکہ [illegible] ہدایات پر عمل کیا جائے تو دین و دنیا میں فلاح حاصل ہو گی۔ [illegible] اسلام کے سوا کہیں بھی دارین کی فلاح حاصل نہ ہو سکے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج انتہائی مادی ترقی کے باوجود سکونِ قلب اور اطمینان دل مفقود ہے [illegible] اِن عظیم وہ آسمانی مکمل ہدایت ہے جس کا ہر دانشور اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا، چنانچہ اس سلسلہ میں بعض مغربی فلاسفر کے بیانات [illegible] اس پر شاہد ہیں:۔

دین ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی نجات میں مسلمان کا خسارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
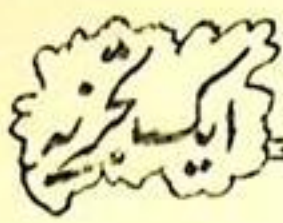
فرقہ بندی اور امتِ مسلمہ

ایک تجزیہ

حافظ محمد عبدالحلیم قاسمی فاضل جامعہ نظامیہ

اس دورِ نامسعود میں یوں تو ملت اسلامیہ پر مختلف آزمائشیں ہوئیں اسکو خوب تختۂ مشق بنایا گیا فتنے اور فساد کی نت نئی صورتیں اور عجیب شکلیں نمودار ہونے لگیں سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اسی امت کے افراد میں آپسی اختلافات، ذاتی تعصبات اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ جن سے آگے کا تصور بھی مشکل ہے یہ مواقعات خواہ مذہب و مسلک کی شکل میں ہوں یا معاشی و معاشرتی دوڑ دھوپ کے نتیجہ میں یا پھر جذبۂ مسابقت اور تعلّی کے حصول کیلئے، بہرصورت یہ امر واقعہ ہے کہ ان آپسی جھگڑوں اور ان کے نقصانات کا تناسب اول الذکر سے بڑھ کر ہے۔ ایک غیر مذہبی شخص بلکہ خود کسی مذہب کا پیرو تھوڑی دیر کے لئے ان حقائق پر غور کرتا اور ان کی علتوں کو تلاش کرتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ آخر ایک ہی مذہب، ایک کتاب اور ایک ہی رسول کے ماننے والوں میں اسقدر اختلاف، منافرت اور تعصب کیوں؟ بسا اوقات یہی خلش ایک مذہبی آدمی کے دل و دماغ سے مذہب کے اثر کو کم کرنے بلکہ سرے سے اس سے علحدگی ہی کا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان اپنا ایک تشخص، ملی وجود اور مذہبی امتیاز رکھتے ہیں اور اس بنا پر وہ "زندہ قوم" کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں، لیکن یہی زندگی مردنی میں تبدیل ہو جاتی ہے اگر وہ اس دین کے خصائص و امتیازات اپنے اندر پیدا نہ کرلیں۔ اس کے احکامات و ماموران کی پابندی نہ ہو، اور منہیات و منکرات سے کلیتہً اجتناب نہ ہو نیز اس وقت جب وہ اپنے فرائض سے کوتاہی برتیں، "خیر امت" کا خطاب ان سے چھین لیا جائیگا اگر ان کا یہ وصف ختم ہو جائے کہ "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" (کافروں اور دشمنوں پر سخت ہیں اور آپس میں رحمدل)۔

ظاہر ہے کہ جو بھی اس دین حنیف کو قبول کر لیا اور اسکے تحت زندگی گزارنے کا عزم کرلیا تو پھر اسکی جان، مال اور آبرو کی حفاظت سب کا فریضہ ہوگا۔ وہ گویا ایک "لڑی" اور سلسلہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی نسبت سرچشمہ شریعت صاحب الوحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتی ہے۔ اسلام ایک شہر پناہ ہے جسکی حفاظت کا ذمہ اور عہد خود خالق کائنات عزوجل نے کیا ہے یہ بات کس قدر تحیر آمیز اور تاسف خیز ہے کہ اس دین کے ماننے والوں اور ملت کے پیروؤں میں اسقدر منافرت اور ہوا و ہوس کا غلبہ ہو کہ ایک دوسرے پر تکفیر و تذلیل کی بوچھار کیجائے انہیں دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی ہر ممکنہ سعی کی جائے۔

ہمدردی و غم خواری، عاجزی و انکساری کے جذبات
دکھ درد بانٹنے اور ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کے
احساسات تو خیر کیا ہوتے آپس میں جڑ بنیاد ہی مٹا دینے کی
کوششیں اور اس سلسلہ میں غیر معمولی جرأت و ہمت کے
مناظر آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ رسالت شافع محشر،
سرور اکبر، حضور معظم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے
حجۃ الوداع کے موقع پر جو پر اثر اور نصیحت آمیز خطبہ
دیا تھا اور جسمیں واقعات و حوادثات کی پیشین گوئی
اور ان کی جھلک ملتی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ صاحب
بصیرت کیلئے درس عبرت و موعظت کے کئی ابواب اسمیں
پوشیدہ ہیں، ان میں سے ایک وصیت آپ نے یہ بھی
کی تھی کہ لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب
بعضکم رقاب بعض۔

"خبردار میرے بعد آپس میں ایک دوسرے کی
تکفیر مت کرنا، کہ اسکے ذریعہ ایک دوسرے کے در پے
آزار ہوں"۔ لیکن یہ مرض ہم میں سرایت کر گیا ہے اور
جا و بے جا دائرۂ اسلام کو تنگ کرنے اور لوگوں کو
ضیق و مشقت میں مبتلا کرنا ہمارا محبوب مشغلہ بن گیا ہے
اس شغل کے پسندیدہ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا
اگر یہ ثابت ہو جائے کہ واقعتاً بات وہی ہے جسے
پیش کیا جاتا ہے اور حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے
حالانکہ بات کچھ اور ہے، حقائق و تاریخ کسی اور چیز کا
انکشاف کرتی ہے، چنانچہ تعمق نظر اور سنجیدہ غور و فکر سے
اگر ہم کام لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تکمیل شریعت
اور نبی اکرم صلعم کی رحلت کے بعد ابتداءً تو امت مسلمہ کے
اختلافات سیاسی نوعیت کے تھے اور خلافت و اقتدار
کے سلسلہ میں ذاتی آراء و خیالات علحدہ تھے پھر اسکے بعد
ان کو مذہبی رنگ دیا گیا اور عیار قسم کے لوگوں نے مذہب کے
عنوان سے چاہا کہ اپنے مزعومات مظنونات کو پیش
کریں۔ رفتہ رفتہ یہ اغلوطات حق و باطل کا معیار بن گئے
ان سیاسی بکھیڑوں کے بعد معتقدات کے باب میں بھی لوگوں
نے دخل اندازی شروع کر دی اور قیاس و تاویلات سے
کام لینا شروع کیا۔ سب سے پہلے تقدیر جیسے نازک مسئلہ کو
خواہ مخواہ محدود عقل و فہم سے حل کرنے کی کوشش کی گئی
جسکے نتیجہ میں ضلالت و گمراہی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ حدیث
کی معروف و مستند کتاب صحیح مسلم میں ہے کہ "اول من
قال فی القدر بالبصرۃ معبد الجھنی"
سب سے پہلے تقدیر کے مسئلہ پر بصرہ میں معبد جہنی نے گفتگو
کی۔ گویا فرقہ قدریہ جسکے اثرات آج بھی پائے جاتے ہیں
اس کا بانی تھا اسی نے مسئلہ تقدیر کا انکار کیا۔ جو
ایمانیات کا اہم جزو ہے والقدر خیرہ وشرہ
من اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا
ضرورت ہے کہ یہ خیالات بیرونی اثرات سے مسلمانوں
میں پیدا ہوئے، یا پھر ان کے آبائی رسومات کو از راہ
غلط فہمی و نادانی انہوں نے دین میں داخل کر لیا اور
اس آیت کے مصداق بن گئے فیتبعون ما تشابہ
منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله۔
(پس وہ متشابہات کے پیچھے چلتے ہیں فساد کی نیت لیئے ہوئے)
وما یعلم تاویله الا اللہ والراسخون فی العلم
یقولون آمنا به کل من عند ربنا (حالانکہ
انکی تاویل اور اصل حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے
اور جو راسخ فی العلم ہیں، وہ بس یہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر
ایمان لاتے ہیں ہر چیز ہمارے رب کیجانب سے ہے) پ۳ آل عمران
امام بخاری نے اپنے رسالہ "خلق افعال العباد" میں

معتزلہ و قدریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

المعتزلہ فانھم ادعوا ان فعل اللہ مخلوق و ان افعال العباد غیر مخلوق و ھذا اخلاف علوم المسلمین الا من تعلق من البصریین بکلام سنسویہ کان مجوسیا فادعی الاسلام ص ۱۲

(معتزلہ کا دعوٰی ہے کہ اللہ کا فعل مخلوق ہے اور بندوں کے افعال کا خالق خدا نہیں ہے حالانکہ یہ مسلمانوں کے عقیدہ کے خلاف ہے، ہاں یہ بات وہی کہہ سکتے ہیں جنہوں نے بصرہ میں سنسویہ نامی شخص کی پیروی کی ہو اور سنسویہ مجوسی تھا بعد میں خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا)

اسی طرح دیگر فرقے جو عالم وجود میں آئے جیسے جبریہ، جہمیہ، کرامیہ، خارجیہ وغیرہ ان کی حقیقت بھی یہی ہے کہ یا تو بیرونی اثرات سے انہوں نے رشتہ جوڑ لیا یا پھر آبا و اجداد کے رسومات کو دین میں اپنی طرف سے داخل کر لیا۔ یہ تمام فرقے جس تیزی کے ساتھ ابھرتے گئے اسی رفتار سے مٹتے اور فنا ہوتے گئے اور آج یہ حال ہے کہ کسی ایک فرقہ کی تصنیفات تو خیر کیا ملتیں ان کے عقائد و مزعومات بھی مدونہ صورت میں نہیں ہیں حتیٰ کہ معتزلہ جسے کچھ عرصہ تک اقتدار بھی ہاتھ آیا اور ڈنڈے کے زور سے عوام نے اسے قبول کیا بھی وہ بھی قائم نہ رہ سکا اور دین حق کی ضیا پاشی کے سامنے سب پر گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی۔

طاش کبریٰ زادہ نے "مفتاح السعادت" میں لکھا ہے کہ "معتزلہ کے ہاتھ میں علم کلام کی باگ دو سو سال تک رہی، پھر ان کی غفلت نے انہیں گمنام بنا دیا، علم کلام کی کتابوں میں چیدہ چیدہ جو ان کے عقائد ملتے ہیں وہ علمائے اہل سنت اور ان کے اہل علم کی تصنیفات کے طفیل کہ انہوں نے تردید کے لئے ان کا ضمناً ذکر کر دیا۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ فرقہ بندی کی ابتداء خلفاء کے اخیر زمانہ میں ہوئی اور مذہبی اختلافات اگر تھے تو صدر اول میں اور اسکا مصداق یہی فرقے ہائے باطلہ ہیں۔

مشہور حدیث ہے ستفترق امتی علی ثلث و سبعین فرقۃ الخ (یعنی میری امت میں تہتر فرقے ہونگے ان میں صرف ایک جماعت ناجی (نجات پانے والی) ہوگی۔ باقی تمام گمراہ اور دوزخی ہونگے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ وہ کونسی جماعت ہے اے اللہ کے رسولؐ، آپ نے فرمایا کہ "ما انا علیہ و اصحابی" جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں، جسے اصطلاحاً اہل سنت والجماعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کم علم اور نادان قسم کے لوگوں نے بدقسمتی سے سمجھ رکھا ہے کہ اس حدیث کا مصداق وہ مختلف جماعتیں اور مکاتیب فکر ہیں جو مسلمانوں میں مختلف لائنوں پر کام کرتی ہیں اور حالات کی مناسبت سے انہوں نے اپنے لئے ایک خاص طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے۔ اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو پتہ چلیگا کہ حقیقت کچھ اور ہے اور لوگوں نے جو باور کر رکھا ہے اس کا اصل مطلب سے کچھ علاقہ ہی نہیں ہے۔

جمہور علماء کے بموجب اسلام کے کل آٹھ فرقے ہوئے ہیں پھر اسکی مختلف شاخیں ہوگئی ہیں جس کی تفصیل یہ ہے (۱) معتزلہ (۲) قدریہ اس کے بیس فرقے ہوگئے ہیں (۳) شیعہ اس کے کل بائیس فرقے ہوگئے ہیں مثلاً روافض، اسماعیلیہ، داؤدیہ وغیرہ

(۴) خوارج، ان کے سات فرقے ہو گئے۔
(۵) مرجیہ، اسمیں بھی پانچ مختلف جماعتیں اور شاخیں ہیں۔ (۶) جہمیہ، اسکے تین فرقے ہوئے (۷) جبریہ، انمیں چار فرقے ہوئے۔ (۸) مشبہ اس کے کل گیارہ فرقے ہوئے۔ ان تمام کو اگر جمع کرلیں اور پھر اہل سنت والجماعت کو سامنے رکھیں تو مذکورہ حدیث پوری طرح منطبق ہوجائے گی اور مفہوم سامنے آجائیگا۔ اس طریقہ سے یہ فرقے ہائے ضالہ صفحہ ہستی پر ابھرے اور ہمیشہ کیلئے نیست و نابود ہوگئے۔ اہل سنت والجماعت ہی کا طبقہ ہے جو واقعتاً جادۂ اعتدال پر قائم ہے اور ان شاء اللہ قیامت رہیگا۔

دوسرا مطلب بعضوں کے نزدیک یہ ہے کہ حدیث میں جو بہتر یا تہتر کا عدد مذکور ہے وہ حصر کیلئے نہیں بلکہ تکثیر اور زیادتی کے لئے ہے کوئی ضروری نہیں کہ وہ تعداد پوری بھی ہو بلکہ مقصد فتنوں کی خبر دینا اور اہل حق کو بشارت سنانا ہے۔ اس سے بھی اور آگے بڑھیں تو معلوم ہوگا کہ محدثین کی ایک جماعت جس میں ابن جوزی اور صاحب قاموس علامہ مجدالدین فیروز آبادی وغیرہم نے اس حدیث کی "صحت" کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔

بہرحال یہ بات منقح ہو کر سامنے آگئی کہ اس حدیث کا مطلب ہرگز وہ نہیں لیا جاسکتا جیسے ہمارے کم علم اور عامیانہ ذہن رکھنے والوں نے سمجھ رکھا ہے اور اہل سنت والجماعت کا خود ساختہ لیبل اپنے اوپر چسپاں کر کے دوسروں کیلئے

تنگی کے سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔

یہ تو ناممکن ہے اور موجودہ دور میں اس کا تصور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمان کم از کم بین الاقوامی پیمانہ پر ایک جماعت کے تحت آجائیں اور کسی ایک شخصیت پر متفق ہوجائیں اور پھر متحد و منظم طور پر کام ہو، اس سرزمین پر خلیفۃ اللہ کا حقیقی رول ادا کریں اور پھر اسکے نتیجہ میں فتح و نصرت، کامیابی و کامرانی کے وہ جلوے سامنے آئیں کہ جنکے نظارے چشم کائنات نے ایک دو نہیں متعدد بار کرچکی ہے اور پھر تمام دنیا امن و اطمینان کی سانس لے تو ایسا سوچنا حقائق سے آنکھیں پھیر لینے کے مترادف ہوگا بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہوگا (وقتی طور سے اور موجودہ حالات کے پیش نظر) کہ تمام جماعتیں اور ادارے جو مختلف طریقوں پر اور متعدد لائنوں پر دین و ملت کے کسی بھی شعبہ کی خدمت انجام دے رہے ہوں وہ اپنا کام برابر جاری رکھیں "کونوا عباد اللہ اخوانا" کے مصداق بن کر ایک دوسرے سے مزاحم ہوئے بغیر جد و جہد اور کوشش ہوتی رہے، البتہ جو مسائل اور اقدار مشترک ہیں اور جن کی افادیت و اہمیت سب کے نزدیک یکساں ہے اس سے مفید نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

غرض کہ اہل سنت والجماعت ہی میں اگر چند جماعتیں ہو جائیں اور ہر ایک اپنے اپنے تفردات اور جداگانہ امتیازات کے ساتھ متشخص ہو جائے تو وہ اہل سنت ہی کے دائرہ میں رہیں گے، محض طریقہ کار کا اختلاف انہیں اس سے نہ ہٹا دے گا۔ اصول اور بنیادیں تو ایک ہوں اور ہر گوشہ سے واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

(اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ
مت پیدا کرو) کے دعوے کئے جائیں اور اتحاد و
اتفاق کی تلقین کیجائے لیکن جب ملت کے انتشار
کا وقت ہو اور زمانے کے تقاضے اس بات کو متقاضی ہوں
کہ مسلمان جسد واحد کیطرح ایک مضبوط سیسہ پلائی ہوئی
دیوار بنکر ہر آزمائش و فتنہ کا مقابلہ کریں اپنے صفوں میں
استحکام پیدا کریں کس قدر افسوس اور ندامت کی بات
ہے کہ وہاں ایک دوسرے کی اہانت اور عزت ریزی کو ہی اسلام سمجھا جائے
اس موقع پر اگر کسیکے ذہن نارسا میں یہ بات کھٹکے کہ
خود علماء اہل سنت میں جو مختلف طریقے اور خیالات
ہیں اور ائمہ مجتہدین و فقہائے کرام کے جو علحدہ اور
انفرادی اجتہادات و افکار ہیں اس کا کیا ہوگا؟
اور اہل سنت میں وحدت کس طرح قائم ہو سکے گی؟!
تو جوابا عرض کیا جائیگا کہ دراصل یہ اختلافات نفسی نہیں
اور ذاتی تعصب کے بل بوتے پر تصورات نہیں پیدا
ہو گئے بلکہ یہ مکاتیب فکر ہیں SCHOOLS OF THOUGHTS انہیں
کہا جاتا ہے کہ تابعین کے آخری عہد میں علمائے حق کی
ایک عظیم ترین جماعت نے کتاب و سنت کو سامنے رکھتے
ہوئے پیش آمدہ مسائل اور مفروضہ حوادثات کی تنقیح
کی اور ان کا حل خداداد بصیرت سے نصوص میں تلاش کیا
اور اس طریقہ سے امت کیلئے آسانی پیدا کر دی خواہ وہ
امام ابو حنیفہ رح ہوں یا امام شافعی رح، امام مالک رح ہوں
یا امام احمد بن حنبل رح۔ قدرت نے ان اکابرین سے دین
کی حفاظت و اشاعت کا کام لیا جسکے نتیجہ میں "فقہ"
جیسی بیش بہا شئے ہمیں حاصل ہوئی۔ اب کوئی حنفی
ہو یا شافعی، امام مالک کے مسلک کی پیروی کرتا ہو یا
امام احمد کے مذہب کے مطابق عمل کرتا ہو وہ اہل سنت
والجماعت سے ہی ہوگا اور انہیں میں کا ایک فرد سمجھا
جائیگا۔ ان اجتہادات سے تو درحقیقت "الدین
یسر و لا عسر" (دین آسان ہے مشکل نہیں)
کی صورت سامنے آگئی ورنہ امت تنگی میں پڑ جاتی
اور کتاب و سنت کے عمیق ترین حقائق پر کوئی بھی
مطلع نہیں ہو سکتا تھا اور اپنی زندگیوں کے انتشار سے بچ نہیں پاتا
"میزان الکبری" میں امام شعرانی نے سفیان ثوری کا
یہ قول نقل کیا ہے کہ "لا تقولوا اختلاف العلماء
فی کذا و قولوا قد وسع العلماء علی الامۃ بکذا"
(یعنی ایسا مت کہو کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے
بلکہ یوں کہو کہ علماء نے امت پر اس طرح وسعت کی)
یہ چاروں مذاہب پر اجماع ہو چکا ہے۔
شاہ ولی اللہ نے "عقد الجید" میں لکھا ہے کہ
"جمہور علماء نے اتفاق کیا ہے کہ دین اسلام میں
چاروں مذاہب حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی حق پر ہیں
اور اہل سنت والجماعت ہی ہیں اہل حق کوئی ان سے خارج نہیں"
فقہائے کرام نے اپنی مختلف آراء کے باوجود اور مجتہدین
عظام نے مسائل میں تشخص کے باوجود الجھا نہیں اور نہ ان کی
وجہ سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی بلکہ جہاں تک
ہو سکے احترام ملحوظ رکھا اور وہ تمام جذبات بلکہ اس
سے بھی زیادہ کا اظہار کیا جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان
سے ہونے چاہئیں۔ واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں کہ
ائمہ کرام نے مروت و ایثار اور وسیع النظری سے کیا کچھ
نہ کیا، ان کے متبعین اور مقلدین نے بھی ان ائمہ کے
اسوۂ حسنہ کو ہر وقت پیش نظر رکھا اور بلا کسی نزاع کے
آپسی جھگڑوں کو حل کر کے ان حیات کو آگے بڑھاتے
رہے۔ "فتاوی ابن تیمیہ" میں ہے کہ مدینہ منورہ میں

امام ابو یوسف خلیفہ ہارون کے ساتھ تھے۔ ہارون ہی کو امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا۔ اس نے وضو کے بعد حجامت کیا تھا یعنی پچھنے لگوائے تھے خون نکلنے کے سبب مذہب حنفی کی رو سے وضو ٹوٹ گیا لیکن امام مالک چونکہ خون کو ناقض وضو نہیں مانتے انہوں نے اسی حال میں خلیفہ کو نماز پڑھانے کا فتویٰ دیا اور متابعت کرنے لگے۔ امام ابو یوسف بھی بلا تذبذب کے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ تاریخی الفاظ یہ بھی ہیں کہ "ولم یعد" اسکے بعد نماز کا اعادہ نہیں کیا۔

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک حجامت ناقض وضو ہے لیکن صحابہ و تابعین کی ایک جماعت اس کی قائل نہیں ہے جن میں مشہور تابعی سعید بن مسیّب بھی ہیں۔ امام احمد ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "کیف لا اصلی خلف سعید بن مسیّب" (میں کس طرح اور کیونکر سعید بن مسیب کے پیچھے نماز نہیں پڑھونگا) (فتاویٰ ابن تیمیہ)

امام شافعی کا تو معروف واقعہ ہے کہ وہ امام ابو حنیفہ کی قبر مبارک پر تشریف لائے تو فجر کی نماز وہیں ادا کی لیکن اپنے مسلک کے مطابق دعائے قنوت نہ پڑھی، شاگردوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ "اجلالاً لصاحب ھذا القبر" اس صاحب قبر کی تعظیم و تکریم کے پیش نظر کیونکہ امام ابو حنیفہ دعائے قنوت کے فجر میں قائل نہیں ہیں بلکہ وتر میں پڑھنے کو کہتے ہیں بعض روایتوں میں ہے کہ امام شافعی جب وہاں آتے اور نماز پڑھنے کا اتفاق ہوتا تو رفع یدین نہیں کرتے۔

اپنے اپنے آراء پر سختی سے کاربند رہنے والے اور عقائد و مسالک کی حفاظت کا راگ الاپنے والے آئیں اور بتائیں کہ کیا انہیں عقیدہ کی حفاظت کا خیال نہ تھا؟ یا وہ بھی مصلحت پسند تھے؟ کتمان حق کرنیوالے تھے۔

مشہور تابعی سعید بن مسیب جو مدینہ کے سات فقہائے عظام میں سے ہیں، ایک جگہ ذکر کرتے ہیں کہ "ومع ھذا کان یصلی بعضھم خلف بعض"

(ان اختلافات کے باوجود وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے)

یہ جملہ بظاہر معمولی نظر آتا ہے لیکن اپنی تہہ میں تمام حقائق و بصائر کو لئے ہوئے ہے۔ دیکھئے! فقہ حنفی کا مسئلہ ہے کہ نماز میں مقتدی سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ یہ صرف امام کے ذمہ ہے مقتدی کا کام خاموش رہنا ہے۔ فقہائے احناف ہی میں بعض نے یہانتک کہدیا کہ اگر کوئی مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتا ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے (شمس الائمہ سرخسی)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے یہانتک حدیث مروی ہے کہ "خدا اس کے منہ میں چنگاری بھر دے جو نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے (مؤطا امام محمدؒ)

اب اس باب میں امام شافعی کیا فرماتے ہیں اور انکا مسلک کیا ہے، وہ بھی سمجھ لیجئے ان کے نزدیک نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض اور ضروری ہے۔ خواہ امام ہو یا مقتدی اس کے بغیر نماز سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ دلائل جانبین کے ہیں اور اسقدر ان پر لکھا گیا ہے کہ دفتر کے دفتر تیار ہو گئے ہیں۔ صورت حال کہیں ایسی پیش آ گئی کہ امام حنفی ہے اور مقتدی شافعی یا امام شافعی ہے اور مقتدی حنفی المسلک ہے تو اب کیا کیا جائے گا؟

تاریخ اور تواتر یہ بتاتا ہے کہ بلا کسی مزاحمت کے یہ معمول چلا آرہا ہے کہ ایک، دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ خود ان ائمہ کرام نے ایسا ہی کیا ہے" اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ شہادت دہرائیے کہ "ومع ھذا کان یصلی بعضھم خلف بعض"۔

بعض بدعمل اور دین سے عمداً دور رہنے والے لوگ ان اختلافات کو اپنی بدعملی کی آڑ بناتے ہیں۔ اگر انہیں کچھ نصیحت کرنے جائیں یا امر بالمعروف کا موقع آجائے تو جھٹ ان چیزوں کا حوالہ دیا جاتا ہے

باقی بر صفحہ ۶۴

۸۶/۹۲

حیاتِ انبیاء کرام علیہم السلام

مولانا صادق محی الدین صاحب
استاذ جامعہ نظامیہ

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کا معاملہ باوجود
بشر ہونے کے بشریت سے جدا اور ممتاز ہے۔
ان کو اپنے پر قیاس کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ امتیازی تبارک خصوصیات
عطا فرمائی ہیں جو عام بشری تقاضوں سے مختلف ہیں۔
پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ خصوصیات
تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے کہیں زیادہ ودیعت
فرمائے گئے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں آقائے
دوجہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں
صفوں کی درستگی کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے
ہیں کہ استووا استووا فوالذی نفسی بیدہ
انی لاراکم من خلفی کما اراکم من بین یدی
اپنی صفوں کو سیدھی و درست کرلو۔ (ابوداؤد)
اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے
میں تم کو اپنے پیچھے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے
اپنے سامنے سے۔

آپ مسلسل روزے رکھتے مگر طعام و افطار سے
مستغنی، جب صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم
اجمعین آپ کے نقش پا پر عمل پیرا ہونے کی کوشش
فرماتے تو ایکم مثلی ارشاد فرما کر انہیں
صوم وصال سے منع فرماتے۔

چنانچہ ایک حدیث شریف میں جس کے راوی حضرت
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، رسول اکرم صلعم نے
صوم وصال (یعنی مسلسل بغیر افطار روزے رکھنے)
سے منع فرماتے تو اس پر ایک صحابی نے رسول اللہ صلعم
نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا انک تواصل
یارسول اللہ ترجمہ۔ اے اللہ کے رسول صلعم
آپ کا معمول صوم وصال ہے تو آپ نے ارشاد
فرمایا۔ ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی
ربی و یسقینی۔ تم میں کون میری طرح ہے
میں رات گزارتا ہوں اس حال میں کہ میرا پروردگار
مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔

نیند سے آپ بھی آسودگی حاصل کرتے مگر ایسی
نیند نہیں جو غفلت طاری کردے اور نقض وضو کا
سبب بنے بلکہ آپ کی نیند دوسروں کی حالتِ
بیداری سے کہیں افضل و برتر۔ چنانچہ ایک مقام
پر ارشاد فرماتے ہیں۔

ان عینی تنامان ولا ینام قلبی
میری آنکھیں سوتی ہیں پر میرا دل نہیں سوتا۔
یہ ایسی نیند ہے جس پر سارے عالم کی بیداریاں
قربان۔ کیونکہ اس کیفیت میں سارے کا سارا
عالم غیب ان پر منکشف جب کہ عام انسانوں پر

غفلت شدید طاری ہو جاتی ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی اس حالت کے محسوسات و ادراکات کو وحی کا مقام عطا فرمایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کو بیدار نہیں فرمایا کرتے تھے حتیٰ اس کہ آپ بذات خود بیدار ہو جائیں۔

حضرت عمران بن حصین رض فرماتے ہیں۔

وکنا لا نوقظ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من منامہ اذا نام حتی یستقیظ۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس خوف سے کہ کہیں آپ پر اسرار و معارف منکشف ہو رہے ہوں اور بیدار کرنے سے خلل واقع ہو جائے۔ جب کہ صرف آپ کی آنکھیں سوتی ہیں اور قلب نہیں سوتا ہے لا انکہ نیند کو موت کی نظیر فرمایا گیا۔ اس حدیث پاک کی روشنی میں حیات انبیاء کا مسئلہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ جب آپ کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں تو آپ کا دنیا سے پردہ فرمانا ہماری موت کی طرح کیسے ہو سکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رض کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد حضرت عائشہ رض بلا کسی حجاب و تکلف کے مزار شریف پر حاضر ہوا کرتی تھیں لیکن جب فاروق اعظم رض بھی مدفون ہوئے تو اچھی طرح کپڑے میں لپٹی ہوئی جاتیں چنانچہ وہ فرماتی ہیں۔

کنت ادخل البیت الذی دفن معہما عمر واللہ ما دخلت الا وانا مشدودۃ علی ثیابی حیاءً من عمر۔

ام المومنین کے اس عمل سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ بھی حیات انبیاء و صدیقین و شہداء و صالحین کی قائل تھیں ورنہ وہ حضرت عمر رض کی وجہ پردہ کا اہتمام نہ فرماتیں۔ حیاء من عمر کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ وہ حضرت فاروق اعظم سے حیاء و حجاب کا کیا سوال۔ اس حدیث پر شیخ عبد الحق محدث دہلوی رح لمعات میں تحریر فرماتے ہیں اوضح دلیل علی حیوٰۃ المیت

ترجمہ: میت کی حیات پر یہ بہت ہی واضح دلیل ہے

عن انس رض ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اسری بہ مر بموسیٰ صلوٰت اللہ علیہ وھو قائم یصلی فی قبرہ۔

حضرت انس رض روایت فرماتے ہیں کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شب معراج میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا اور وہ اپنی مزار میں کھڑے ہو نماز پڑھ رہے تھے (مسلم)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے آپ کو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ایک جماعت کے ساتھ دیکھا تو میں نے حضرت عیسیٰ ع و حضرت ابراہیم نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام کو کھڑے ہوئے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس کی روایت بھی مسلم نے کی ہے۔

حضرت ابن عباس رض سے مروی ہے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان وادی ازرق سے گزر رہے تھے۔

حضور نے فرمایا کہ میں موسیٰؑ کو دیکھ رہا ہوں وہ اپنی دونوں انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالے زور زور سے لبیک پڑھتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں پھر آپ نے حضرت موسیٰؑ کے رنگ وروپ وبالوں کے متعلق بیان فرمایا۔

حضرت انس رضؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الانبیاء احیاء فی قبورہم یصلون ۝

انبیاء کرام علیہم السلام زندہ ہیں اپنی آرام گاہوں میں نمازیں ادا فرماتے ہیں۔

حضرت ابو الدرداء رضؓ روایت فرماتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ پر جمعہ کے دن درود وسلام کثرت سے پڑھا کرو کیونکہ وہ یوم مشہود ہے۔ اس دن فرشتے زیادہ تعداد میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور جمعہ کے دن درود پڑھنے والے جب تک وہ درود وسلام میں مصروف رہیں ان کا درود وسلام مجھ پر پیش ہوتا رہتا ہے۔

راوی حدیث نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللہ حیّ یرزقُ۔

بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین پر یہ بات حرام قرار دی ہے کہ وہ انبیا کے اجسام کو کھائے۔ پس اللہ کے نبی زندہ ہیں اور رزق بھی پاتے ہیں مندرجہ صدر احادیث میں آپ نے دو اہم خصوصیات بیان فرمائیں جو انبیاء کرام کی حقیقی حیات دائمی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ ایک تو دوامی یاد الٰہی اور عبادت، دوسرے رزق کا پانا۔ یاد الٰہی کے رشتہ وتعلق کے ساتھ موت کا کوئی علاقہ نہیں۔ اسلئے بزرگان سلف وعلمائے اہل سنت والجماعۃ کے نزدیک نقطہ حیات ذکر الٰہی کا تعلق ہے۔

اہل جنت کی حیات دائمی پر قیاس کرتے ہوئے کہ یقیناً اہل جنت کی حیات دائمی کا دارومدار ذکر الٰہی کے دوام کے ساتھ ہے۔

ذکر الٰہی سے روح کو اور رزق سے جسم کو غذا ملتی ہے۔ حدیث پاک میں ان دونوں کو بیان فرمایا گیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یقیناً جسم وروح یکجا ساتھ حیات ہیں ورنہ لفظ یرزق بے محل ہو جاتا رزق کی ضرورت تو جسم کو ہوتی ہے روح کو نہیں البتہ حیات کی حقیقی کیفیت کا علم تو بس اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہے۔ احادیث سے ثبوت کے باوجود جو لوگ حیات انبیاء کا انکار صرف اس لئے کرتے ہیں کہ حیات دائمی تو اللہ تعالےٰ کی صفت ہے اس طرح یہ بات ان کے ذہن و فہم میں شرک ہے اور توحید کے منافی ہے۔

عام مسلمان اس دلیل کو بہت آسانی سے قبول کر لیتے ہیں اور وہ بھی حیات انبیاء کا انکار کر بیٹھتے ہیں لیکن اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور۔ دلیل جتنی جلد متاثر کرنے والی ہے اتنی ہی بے جان اور کھوکلی بھی ہے۔

اگر ذہن وفہم کسی کے پاس گروی نہیں ہے تو اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیات (کسی کی دی ہوئی نہیں) ذاتی ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی

حیات اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔
احادیث میں ہمیں بکثرت روایات ملتی ہیں کہ آپ کے فضلات، آپ کے پسینے میں مشک و عنبر کو بھی شرمندہ کرنے والی مشام جان کو ان سے کہیں زیادہ معطر کرنے والی خوشبو تھی۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ آپ کے پسینۂ مبارک کو جمع کرتے اور اسے عطر میں ملا کر یا عطر کی بجائے استعمال کرتے۔ چنانچہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے آپ نے قیلولہ فرمایا آپ کے جسم مبارک پر پسینہ آیا۔ میری ماں ام سلیم شیشی لے آئیں اور پسینہ مبارک اس میں ڈالنے لگیں اتنے میں آپ بیدار ہو گئے۔ ارشاد فرمایا ام سلیم یہ کیا کر رہی ہو انھوں نے عرض کیا ھذا عرقک نجعلہ لطیبنا وھو اطیب الطیب (مسلم) یہ آپ کا پسینہ ہے اس کو اپنی خوشبو میں ملا دینے سے وہ زیادہ خوش بودار ہو جاتا ہے۔
بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے۔
نرجو برکتہ لصبیاننا قال اصبت
ایک روایت میں ام سلیم نے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ ہمیں امید ہے کہ اس کی برکت ہمارے بچوں کو بھی حاصل ہوگی تو آپ نے ارشاد فرمایا تم نے حقیقت کو پالیا۔
اہل جنت کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ وہ کھائیں گے اور پئیں گے لیکن ان کو تقاضائے حاجت نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی گندگی ان کے اجسام سے خارج ہوگی۔ آپ کے اس ارشاد پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ جب وہ کھائیں گے اور پئیں گے تو وہ کہاں جائے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مشک و عنبر کی خوشبو لئے ہوئے پسینہ اور خوشبو والے ڈکار کے ساتھ خارج ہو جائیگا اور ذکر الٰہی کا تعلق ان کے ساتھ دائمی ہوگا جیسے سانس دائمی ہے۔
جنت میں اہل جنت کی جو خصوصیات ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام میں ودیعت فرما دی ہے، نیند کی حالت میں قلب کا بیدار ہونا، پسینہ و دیگر فضلات کا مشک و عنبر سے بھی زیادہ معطر ہونا اس دنیا میں ہر وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہنا اور اس ذکر الٰہی کے تعلق کا دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد بھی منقطع نہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں رزق کا دیا جانا یہ سب ایسے حقائق ہیں جو حیات پر دلالت کرتے ہیں۔
انبیاء کرام علیہم السلام اور بالخصوص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں عقیدت و احترام کی بنیاد پر ہزاروں خصوصیات جو احادیث و آثار سے ثابت ہیں اگر بیان کئے جائیں تو تب بھی ہم سے حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

آپ کے ذکر مبارک کو تو اللہ نے بلند فرمایا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہو چکا ہے و رفعنا لک ذکرک۔ آپ کی علو مرتبت اور رفعت ذکر تو خود خالق کائنات نے

بیان فرمائی اور احادیث و آثار میں انبیاء کرام
علیہم السلام اور خود آپ کی خصوصیات اور امتیازات
کو ظاہر کیا جا کر عوام تو عوام انبیاء اور خواص بشر
تک میں جو خط فاصل شریعت مقدسہ نے قائم
فرمائی جب تک بھی اور جہاں کہیں بھی اس کا خیال
رکھا گیا اور آپ کے ذکر مبارک سے دلوں کی
محبت کو گرمایا گیا تو وہ نہ صرف عزت و عظمت کے
مالک رہے بلکہ اللہ نے اپنے حبیب پاک کے
صدقے مسلمانوں کی رفعت کا پرچم لہرایا۔

جب کبھی اور جہاں کہیں مسلمانوں نے اس
خط فاصل کو توڑا ذکر حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ
وسلم سے منہ موڑا ذلت و رسوائی کے عمیق غاروں
میں جا پڑے شہداء کی حیات کو خود قرآن پاک
نے ثابت کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ
امواتاً بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون
فرحین بما اتٰھم اللہ۔

احادیث میں بکثرت شہداء کے واقعات
موجود ہیں۔ تاریخ و سیرت میں بہت سے واقعات
ملتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے
زمانہ خلافت میں مدینہ منورہ میں نہر نکالنے کا
ارادہ فرمایا اور اتفاقاً اس نہر کی گزرگاہ شہدائے
احد کے مزارات پر سے تھی تو آپ نے متعلقین کو
مطلع کیا کہ وہ یہاں سے ان کو منتقل کرلیں۔ جب
ان شہداء کو اس غرض سے منتقل کیا جانے لگا تو
بالکل اپنی اصلی حالت پر تر و تازہ پائے گئے یہاں
تک کہ کھودنے میں حضرت حمزہؓ کے پائے اقدس پر
کدال لگ گئی تو خون جاری ہو گیا۔

قرآن نے ہمیں عقیدۂ حیات شہداء کی تعلیم دی
اب رہا ان کی حیات کی کیفیت کے بارے میں
"ولکن لا تشعرون" کے ذریعہ اس بات کی
تردید بھی فرما دی کہ اس حیات کا ادراک و شعور
تمہارے بس کی بات نہیں۔ جب حیات شہداء ثابت
تو انبیاء کی حیات بدرجہ اولیٰ ثابت شدہ حقیقت
ہے کیونکہ انبیاء شہداء سے کہیں زیادہ افضل و برتر ہیں

تذکرۃ الموتیٰ والقبور میں حضرت قاضی
ثناء اللہ پانی پتیؒ جن کو حضرت مرزا مظہر
جانجاناں قدس سرہ العزیز بیہقی ثانی فرمایا کرتے تھے
وہ لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ در شہداء می فرماید
بل احیاءٌ عند ربھم الخ مراد آں باشد کہ
حق تعالیٰ ارواح ایشاں را قوت اجساد می دہد
ہر جا کہ خواہند سیر کنند و ایں حکم مخصوص شہدا
نیست۔ انبیاء و صدیقاں از شہدا افضل اند
و اولیا ہم در حکم شہداء اند کہ جہاد بالنفس
کردہ اند کہ جہاد اکبر است رجعنا من
الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر
ازاں کنایہ است۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ شہداء کی نسبت فرماتا ہے
وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس۔ میں کہتا ہوں
کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روحوں کو جسم
کی قوت دیتا ہے کہ جس جگہ چاہیں سیر کریں اور
یہ حکم شہداء کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

انبیاء اور صدیقین شہداء سے افضل ہیں اور اولیا بھی شہداء کے حکم میں ہیں کیونکہ وہ نفس کے ساتھ جہاد کرتے ہیں جو سب سے بڑا جہاد ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا ارشاد ہے کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف پلٹ آئے ہیں یعنی مشرکین سے لڑائی کے بعد اب نفس سے مقابلہ ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز تفسیر فتح العزیز میں لکھتے ہیں کہ پس در حقیقت حیات ایشاں اتم از حیات دنیوی است "ولکن لا تشعرون" لیکن شما شعور ندارید کہ ایشاں در ترقی اعمال و در تمتعات و تلذذات بدنی با شما شریک اند بلکہ از شما زیادہ تر افزوں تر بایں جہت کہ آں ابدان ایشاں از نظر شما غائب اند و در عالمے دیگر ورائے عالم شما رزق ایشاں و سیر دور ایشاں مقرر است مانند کسے کہ در ولایت میوہ ہائے خورد و سیر گلزار ہا نماید و اہل ہندوستاں او را بمیرد مردہ انگارند۔

پس حقیقت میں ان کی زندگی تمہاری زندگی سے کامل تر ہے لیکن تم کو اس کا شعور نہیں کیونکہ یہ اعمال کی ترقی اور بدنی لذتوں اور خوشیوں کے پانے میں تمہارے ساتھ شریک ہیں بلکہ تم سے زیادہ اور بڑھ کر ہیں بایں وجہ کہ ان کے جسم تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور دوسرے عالم میں جو تمہارے عالم کے سوا ہے ان کی سیر و گردش مقرر ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص ہندوستان کے سوا کسی دوسری سلطنت میں میوے استعمال کرتا اور باغات کی سیر و تفریح کرتا ہے اور چونکہ اہل ہند اس کو نہیں دیکھتے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مر گیا ہے۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ صدیقین و شہداء حتیٰ کہ اولیاء کاملین حیات حقیقی کے ساتھ زندہ ہیں اور یہ اس دنیا سے بدرجہا افضل و برتر ہے تو کیوں نہ انبیاء کرام ان سے کہیں زیادہ اتم و اکمل حیات دائمی کے مالک ہوں۔ چنانچہ امام بیہقی نے اپنی کتاب حیات الانبیاء میں اس کی تصریح فرمائی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح مبارکہ کو قبض کرنے کے بعد پھر دوبارہ اللہ تعالیٰ واپس فرما دیتا ہے اس لئے وہ شہداء کی طرح اپنے پروردگار کے حضور حیات ہیں۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ ان کی موت کا حاصل اتنا سمجھو کہ وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ کر دئے گئے ہیں۔ ان کا حال فرشتوں کی طرح ہو گیا ہے۔ ہم نہ ان کا ادراک رکھتے ہیں نہ ان کا یعنی جس طرح فرشتہ حیات ہیں لیکن ان کی حیات کا ادراک ہم نہیں رکھتے۔ عدم ادراک کی وجہ فرشتوں کی حیات کا انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح انبیاء کرام بھی حیات ہیں ان کی حیات کا بھی ہم ادراک نہیں رکھتے تو عدم ادراک کی وجہ کیونکر حیات انبیاء کا انکار کیا جا سکتا ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح کے اس فرمان "انبیاء و صدیقاں از شہداء افضل اند" سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء و صدیقین حیات میں شہداء سے افضل و برتر ہیں اور "اولیا در حکم شہداء اند" سے نہ صرف اولیاء کی حیات کا

ثبوت ملتا ہے بلکہ ان کی حیات بھی شہداء کے درجہ کی حیات ہے چنانچہ وہ ایک اور دلیل یہ نقل فرماتے ہیں "رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر" جس کو صحابہؓ نے ایک غزوہ سے واپسی کے بعد فرمایا تھا گویا انہوں نے معرکہ جہاد کو جہاد اصغر اور جہاد نفس کو جہاد اکبر سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ اولیاء اللہ جہاد اکبر میں مصروف ہوتے ہیں اس لئے ان کی حیات مثل شہداء کی ہے۔ حیات انبیاء و صدیقین، اور حیات شہداء و اولیاء کے ثبوت کے بعد ضروری ہے کہ دونوں کی حیات کے فرق کو واضح کیا جائے۔

حضرت محدث دکنؒ نور اللہ مرقدہ نے بڑی بیّن اور لطیف توجیہ بڑے ہی اچھے پیرائے میں بیان فرمائی ہے جو فرق مراتب کے باب میں بے نظیر ہے۔ فرماتے ہیں کہ عام مومنین کی روحیں بھی زندہ ہیں۔ شہداء و انبیاء بھی زندہ تو پھر ان تینوں کی زندگی میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ ہر انسان کی روح زندہ تو رہتی ہے مگر اس جسم خاکی کے ساتھ جب تک رہتی ہے وہ اعمال کے ذریعہ ترقی اور ثواب حاصل کر سکتی ہے برزخ کے جسم میں جانے کے بعد عام انسان کی روح کی ترقی بند ہو جاتی ہے۔ نہ تو وہ برزخ میں کھاتا پیتا ہے اور نہ کوئی عمل کر کے باطنی ترقی حاصل کر سکتا ہے۔ اس واسطے کہ یہ دار العمل نہیں ہے دار الجزاء ہے گو ہر عام انسان کی روح زندہ ہے مگر کھانا پینا باطنی ترقی بند ہونے سے کہا جاتا ہے کہ وہ مر گیا۔ بخلاف اس کے شہیدوں کی روح وہ بھی جسم خاکی چھوڑ کر برزخ کے لطیف جسم میں چلی جاتی ہے

اس لئے شہید پر بھی موت کا اطلاق ہوتا ہے مگر اعمال کے ذریعہ اس کی ترقی بند نہیں ہوتی ہے جسم خاکی میں جیسے عمل کے ذریعہ ترقی کرتے تھے شہید برزخ کے جسم میں جانے کے بعد بھی ویسے ہی بدستور ترقی کرتے اور کھاتے پیتے رہتے ہیں اسلئے کہا جاتا ہے کہ شہید زندہ ہیں۔ زندگی کے سارے آثار موجود ہیں اپنے خدا کے پاس اسکے فضل سے کھاتے پیتے اور خوشیاں مناتے ہیں عمدہ عمدہ نعمت میں ہر قسم کے لذات اور آرام حاصل کر رہے ہیں جہاں چاہے گل گشت کرتے ہیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں رہ کر۔

بخلاف اسکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس جسم مطہر سے نکلی اس لئے آپ پر بھی موت کا اطلاق ہوا۔

"انک میت و انہم میتون"

مگر عالم برزخ میں کوئی ایسا لطیف جسم نہیں تھا جو آپ کی روح مطہر کے لائق ہو اس وجہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نظیر نہ دنیا میں ہے اور نہ عالم برزخ میں اور نہ آخرت میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

رخ مصطفٰے ہے وہ آئینہ
کہ اب ایسا دوسرا آئینہ

نہ ہماری بزم خیال میں
نہ دکان آئینہ ساز میں

آگے حضرتؒ فرماتے ہیں کہ جب عالم برزخ میں ایسا لطیف جسم نہیں رہا تو پھر اسی جسم خاکی میں روح مطہر کو واپس کر دیا گیا اور رسول اللہ صلعم کا

یہی جسم مطہر اس عالم سے عالم برزخ میں منتقل ہو گیا اور اسی کی وجہ سے آپ کو حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ آپ اسی جسم خاکی کے ساتھ عالم برزخ میں تشریف فرما ہیں۔ چونکہ عام انسانوں اور شہداء کی روحیں عالم برزخ میں دوسرے لطیف اجسام میں منتقل ہوئی ہیں اسلئے ان سے جسم خاکی کے لوازم بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ ان کی بیبیوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ ان کی میراث تقسیم ہو سکتی ہے اسکے برخلاف چونکہ رسول اللہ صلعم کا یہی جسم خاکی عالم برزخ میں منتقل ہو گیا ہے اسلئے آپ کے جسم خاکی کے لوازمات منقطع نہیں ہوئے ہیں اسلئے ازواج مطہرات سے آپ کے بعد نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا اور آپ کی میراث تقسیم نہیں کی گئی۔ نبوت حیات کے بعد حیات عدم قدرت کے ساتھ حیات کامل نہیں کہلائی جا سکتی جسطرح ہم دنیاوی اعتبار سے زندہ ہیں اگر ہمیں کسی چیز کی قدرت نہو تو ہماری زندگی کامل زندگی نہیں کہلائی جاتی

اب ایک اشتباہ یہ ہوتا ہے کہ قدرت رکھنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے کسی نبی یا ولی کو قدرت کیسے؟ تو جواب یہ ہے کہ جس طرح حیات اللہ کی عطا کردہ ہے قدرت بھی اللہ کی عطا کردہ ہے۔ باذن الٰہی وہ کسی کی مدد کرتے ہیں بغیر اذن اللہ کچھ نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غنی ہونا اور دوسروں کو غنی کرنا نص قطعی سے ثابت ہے چنانچہ قرآن پاک کی سورۂ برات میں ارشاد فرمایا گیا ولو انھم رضوا ما اتٰھم اللہ من فضلہ ورسولہ۔ کاش وہ راضی ہوتے اس پر جو کچھ دیا اللہ تعالیٰ نے اور اللہ کے رسول نے اسی سورت میں ارشاد فرمایا گیا۔ وما نقموا الا ان اغنٰھم اللہ ورسولہ اللہ تعالیٰ نے اور اسکے رسول صلعم نے ان کو غنی کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو غنی فرماتا ہے اور آپ دوسروں کو غنی فرماتے ہیں۔ اور ایک مقام پر ارشاد فرمایا گیا سیؤتینا اللہ من فضلہ ورسولہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو دیگا اور اللہ کے رسول دیں گے اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ تعالےٰ بھی عطا کرنے والا ہے اور آپ بھی عطا کرنے والے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی بالذات اور مستقل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں اور خاصان خدا میں یہ صفت باعطائے الٰہی ہے مستقل اور بالذات نہیں۔ اس طرح ان آیات مبارکہ سے آپ کے فرمان انما انا قاسم واللہ یعطی اور اوتیت بمفاتیح خزائن الارض کی تصدیق ہوتی ہے اسی اعتبار سے آپکی کنیت ابوالقاسم۔ چنانچہ اسی حقیقت کو حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ مدارج النبوۃ میں واضح فرماتے ہیں۔ داد شدہ آنحضرت ﷺ را مفاتیح خزائن سپرد شد بوی مراد از خزائن اجناس عالم است کہ رزق ہمہ در کف اقتدار وی سپرد و قوت تربیت ظاہر و باطن ہمہ بوے داد مفاتیح خزائن رزق و قسمت آں در دست ایں ید کریم نہادند قولہ صلعم

انما انا قاسم والمعطی ھو اللہ (مسلم)

ترجمہ :۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئیں اور حوالہ کر دی گئیں۔ اس سے مراد اجناس عالم ہے کہ تمام کا رزق آپ کے دست مبارک میں رکھدیا گیا ہے اور ظاہر و باطن کی تربیت کی قوت بھی آپ کو دیدی گئی ہے۔ رزق کے خزانوں کی کنجیاں اور اسکی تقسیم آپ کے دست کریم میں رکھدے گئے ہیں آنحضرت کا ارشاد ہیں بانٹنے والا ہوں اور اللہ عطا کرنے والے ہیں ؎

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں انکے خالی ہاتھ میں

اور حضرت شاہ صاحب شرح مشکوٰۃ باب زیارت قبور میں حضرت غوث الاعظم رض سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی و شیخ معروف کرخی رح وغیرہما کی نسبت لکھتے ہیں کہ تصرف می کنند در قبور کہ خود مانند تصرفہائے ایشاں در حیات خود

ترجمہ :۔ یہ اپنی قبروں میں اس طرح تصرف کرتے ہیں جس طرح دنیاوی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح اپنی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں۔ ان اللہ یعطی لارواحھم قوۃ الاجساد فیذھبون من الارض والسماء والجنہ حیث یشاءون و ینصرون اولیائھم ویدمرون علی اعدائھم وقد تواتر عن کثیر من الاولیاء انھم ینصرون اولیائھم ویدمرون اعدائھم۔

ترجمہ :۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کے ارواح کو جسم کی قوت عطا فرماتا ہے وہ زمین و آسمان اور جنت سے جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں اور اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں متواتر بہت سے اولیاء سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کئے اور دشمنوں کو ہلاک کئے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح الطاف القدس میں کیا فرماتے ہیں کہ عارف باللہ کو تمام عالم کا علم حضوری ہوتا ہے اور یہ علم علم خدائی ہے کہ عارف کامل کو عطا ہوتا ہے۔ خدا کی طرح اپنے آپ میں سارا عالم دیکھتا ہے اور سب کا مشاہدہ کرتا ہے سب اسکے حضور میں وہ سب کے حضور میں اور سب سے جدا اور سب میں موجود۔

نیز اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ انسان کامل مرنے کے بعد فرشتوں سے جاملتا ہے فرشتوں کی طرح اسے الہام الٰہی ہوتے ہیں۔ فرشتوں کے کام اور انتظام عالم سے متعلقہ امور اسکے حوالے کئے جاتے ہیں تو وہ کبھی اللہ کا کلمہ بلند کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو کبھی اللہ کے گروہ کی مدد و اعانت کرتا ہے کبھی انسانوں کو خیر و نفع پہنچاتا ہے۔ کبھی اسے کھانے کا شوق ہوتا ہے تو اسے کھانا ملتا ہے۔

حضرت اویس قرنی رض فرماتے ہیں من کان عارفا باللہ لا یخفی علیہ شیئ۔

جو اللہ کا عارف ہوتا ہے اسپر کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی جن سے دنیاوی زندگی میں استمداد جائز ہے

ان سے برزخی زندگی میں بھی استمداد جائز ہے
چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔
"کل من یستمد فی حیاته یستمد به بعد وفاته"
ایک طرف حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ

اور ان کا گھرانہ اور دیگر اکابرین امت حیات کے ساتھ ان کے قدرت و تصرف کے قائل
اس باب میں فقہائے امت و اکابرین اہل سنت متفق علیہ ہیں۔ تاہم صرف ان اکابرین کے اقوال نقل کئے گئے ہیں جو سب کے نزدیک قابل قدر و قابل عظمت ہیں

باقی صفحہ (۵۴) ایسے لوگوں کے لئے اس واقعہ میں درس عبرت ہے کہ امام مالکؒ سے کسی نے سوال کیا کہ اسلام میں اس قدر اختلافات اور علمائے کرام کی الگ الگ رائیں ہیں تو عمل کس پر کیا جائے اور یہ کیونکر ممکن ہے؟ تو امام مالکؒ نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا اچھا یہ بتاؤ کہ کیا ان کے درمیان نماز کی فرضیت کے بارے میں اختلاف ہے، اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا کوئی روزہ کا منکر ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ یہ بھی نہیں۔ پھر سوال کیا اچھا کیا ان میں کوئی زکوٰۃ کی فرضیت کے متعلق پس و پیش کرتا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ پوچھا کیا حج کے رکن ہونے میں کسی کو شک ہے؟ اس نے کہا نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ امام مالکؒ نے فرمایا جب دین اسلام کے ان ارکان اور اہم فرائض کے متعلق کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے اور سب متفق ہیں تو پھر تمہیں کونسے اختلافات پریشان کر رہے ہیں؟ یہی چیزیں دین کی اساس اور اصل ہیں جاؤ اور ان پر عمل کرو۔ ان پر عمل کرنے سے کوئی امر مانع نہیں ہے اور ان ہی پر نجات کا دار و مدار ہے (موافقات للشاطبی)

یہ ہو سکتا ہے کہ واقعتاً کچھ مکاتیب فکر نظریاتی طور پر الگ علٰحدہ تصورات رکھتے ہوں اور اپنے مخصوص ماحول و فضا کے باعث کوئی ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہو جس سے بظاہر دوسروں کا اتحاد نظر نہ آئے۔ لیکن اس کا علاج یہ نہیں کہ مناظرے کئے جائیں، جدال و مباحثہ کی محفلیں گرم ہوں، اور عوام الناس میں انکا چرچا زور شور سے کیا جائے بلکہ اس کا صحیح ترین حل یہ ہوگا کہ جانبین کے ذی علم اور سنجیدہ حضرات مل بیٹھیں اور تعاون و مفاہمت کی خوشگوار فضا میں کم از کم یہ تو عہد کرلیں کہ ان مسائل اور نظریات کو اسٹیج پر نہیں لایا جائیگا اور ان غیر متعلقہ مباحث کو موضوع نہیں بنایا جائے گا۔

کسی دانشمند نے صحیح کہا ہے کہ چند مسائل جو رائج اور مقبول ہو گئے ہیں جیسے علم غیب وغیرہ، وہ درس و تدریس کے ہیں نہ کہ عوام کے سامنے بیان کرنے کے۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر کام کا ایک محل ہوتا ہے۔ بے وقت اور بے محل اگر کوئی کام کیا جائے تو وہ ایک اعتبار سے ظلم ہوگا کیونکہ ظلم کی تعریف ہی اس طرح کی جاتی ہے کہ "وضع الشئی فی غیر محله"۔ کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا۔ اور پھر وقت کے تقاضوں کو جاننا، اس کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے کام کرنا بھی ضروری ہے۔ اس وقت فرائض اور بینات سے اجتناب اور دوری ہوتی جارہی ہے۔ معاشی اعتبار سے پستی عام ہے علوم دینیہ کے حاملین کا افلاس ہے، دین و مذہب کی اصل اور اساس ہی خطرہ میں ہے تو اب لقہ تاریخ کو دہرانا گویا ظلم کرنا ہے اور صرف اپنے پیروں پر کلہاڑی چلانا ہے بلکہ ملت اسلامیہ کی جڑ بنیاد کو اکھیڑنے کے مترادف ہے یوں بھی اگر دیکھا جائے تو زیادہ تر ان مسائل میں تعبیرات کا اختلاف ہے۔ عموماً مقصد ایک ہی ہوتا ہے لیکن لب و لہجہ کا فرق ہے اور پھر اس جیسے نظریاتی مسائل پر نہ اسلام کا دار و مدار ہے اور نہ ان کے متعلق روز حشر سوال کیا جائیگا۔ چودھویں صدی ہجری کے ایک بیدار مغز سیاح اور زبردست عالم علامہ مقدسی نے اس قسم کے مشاہدات اور ان کے اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنا یہ دردمندانہ احساس نقل کیا ہے کہ

"هذا التعصب الذی تری انما ثورة الجهال والمسترزقون من القصاص وغیرهم واما الائمة فعلی اما ذکرت"

"یہ تنگ نظریاں جنہیں ہم دیکھتے ہیں دراصل یہ شورش جاہلوں کی پھیلائی ہوئی ہیں اور قصہ گو واعظوں کی بے اعتدالیوں کے نتائج ہیں، امت مسلمہ کو ان سے کوئی تعلق نہیں"

بشیر صدیقی۔ کریم نگری
کامل نظامیہ۔ ایم۔ اے۔ ایل عثمانیہ حیدرآباد

ورق گردانی

علم و فن کی ترقی اور تہذیب کی شائستگی کو فروغ دینے کے لئے مطالعۂ کتب ضروری ہے اور یہ ایک محبوب مشغلہ بھی ہے متقدمین کے علوم و فنون اور ان کے تحقیقات و تدقیقات سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنے علم کو ترقی دینے کے لئے متاخرین کے حق میں مطالعۂ کتب ہی بہترین ذریعہ ہے۔

کتاب کیا ہے؟ کتاب مسلسل کاوش؛ و عمر بھر کی محنتوں اور تجارب کا خلاصہ اور ایک مجموعہ ہے جو کسی کے مصنف نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑا ہے۔ کتاب ایک دُرِ نایاب اور بیش بہا دولت ہے۔ جو بڑی تحقیق و تدقیق اور مفید معلومات کو فراہم کرنے کے لئے ان کی تلاش و جستجو کے بعد مرتب کیا ہے۔ متقدمین کی ساری دولت متاخرین کو صرف ان کے کتاب کے مطالعہ سے بغیر کسی کد و کاوش کے گھر بیٹھے حاصل ہو جاتی ہے۔

اگر کوئی کتاب جغرافیہ پر لکھی گئی ہے تو دیکھئے کہ اس کے موجد نے علم جغرافیہ کی تکمیل میں زمین کا چپہ چپہ چھان مارا۔ جغرافیہ نویس کو صحرا نوردی (یعنی جنگل میں گھومنا) کرنی پڑتی ہے۔ کوہ و دشت کی چھان بین کرنی پڑی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جس قدر مسافت ہے اس کو طے کرنا پڑا۔ کتنے نالے چشمے، ندیاں، جھیلیں، نہریں، سمندر حائل ہیں ان سب کو بھی عبور کرنا پڑا۔ پھر ان میں ہر ایک کا طول و عرض اور عمق ان کا منبع و منتہا دریافت کرنا پڑا۔ اس طرح ساری زمین کے کئی کئی چکر کاٹ کر ایک کتاب لکھی اب بعد والوں کا کام صرف اس قدر باقی رہ جاتا ہے کہ موجد اور مصنف نے جو نقوش چھوڑے ہیں ان کا مطالعہ کر کے مفت میں ان کے معلومات سے فائدہ اٹھائیں۔

مختصر یہ کہ یہی حال دیگر علوم و فنون کا ہے۔ خواہ معقول و منقول سے متعلق ہوں یا فروع یا اصول سے علم تاریخ ہو یا طب، صرف ہو یا نحو، ادب ہو یا بلاغت، نظم ہو یا نثر، فلسفہ ہو یا ہیئت یا کوئی اور علم و فن، ہم اپنے مطلب علم و فن کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان علوم و فنون کے مصنفین کی دماغ سوزیوں اور عرق ریزیوں کا ثمرہ حاصل کر سکتے ہیں۔ طالب علم کیلئے مطالعہ کتب از بس ضروری ہے تحصیل علم کے زمانہ میں بھی اور تحصیل علم کے بعد بھی کتب بینی ضروری ہے اس لئے کہ علم ایک دریائے ناپیدا کنار ہے اس کی کوئی حد نہیں مطالعہ جتنا وسیع ہوگا علم میں بھی اتنی وسعت ہوگی اور مطالعہ میں جس قدر کوتاہی ہوگی علم بھی محدود ہوگا۔ آج بلکہ ابھی سے ضروری ہے کہ طلبہ بالخصوص مطالعہ کتب میں مشغول و مصروف رہ کر اس کے ثمرات سے لطف اندوز ہوں اور اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ یہی اپنی خدمت ہوگی ••

عبدالرحیم بن احمد قر موسنی متعلم جماعت فاضل

ہم غور کریں کہ تقلید کیا چیز ہے اس کی حقیقت
و ماہیت کو دیکھیں اور مالہ و ماعلیہ پر بحث کریں اصطلاح
میں تقلید کا مفہوم اس معنی میں مشہور ہے کہ تمام مسائل
شرعیہ فرعیہ میں ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک مخصوص امام کی
اتباع کی جائے۔ سر مو تجاوز نہ کیا جائے اپنے امام
کے مسلک کو باصواب حق با احتمال خطا اور دیگر ائمہ
کرام کے مسلک کو باخطا مع احتمال صواب و حق سمجھے
اس معرکۃ الآرا مسئلہ نے دنیائے اسلام میں ایک
حرکت پیدا کر دی اور مقلدین و غیر مقلدین کے متعلق
گروپ و فرقے پیدا ہو گئے اس کے تاریخی منظر میں گئے
بغیر تقلید شخصی یا تقلید مطلق جائز ہے یا نہیں اگر جواز
کا فتویٰ مل جائے تو کس نوعیت کا حکم لگایا جائے کہ
وہ واجب ہے یا مباح نیز وجوبِ تقلید کی ضرورت
کو واضح کروں گا تقلید شخصی کا مطلب یہ ہے کسی مخصوص
امام کی اتباع کلی کا نام تقلید شخصی ہے اور حسب ضرورت
و سہولت تمام ائمہ کرام کے مسالک کو اختیار کرنا تقلید
مطلق ہے۔ خواہ تقلید کسی نوعیت سے ہو یہ بات غور طلب
ہے کہ تقلید کیوں ضروری ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں
جب کہ ہمارے سامنے قرآن مجید و حدیث شریف واضح
طور پر موجود ہیں اس حقیقت سے ہر کس و ناکس اچھی طرح
واقف ہے کہ سیدھا و صحیح راستہ قرآن و حدیث کا راستہ
ہے اسی میں صلاح دنیا و فلاح آخرت ہے مومن کی زندگی
کا مطلوب اصلی و مقصود ابدی یہی ہوتا ہے کہ وہ ان کی کامل
اتباع کرے اور خوشنودی خدا و رسول حاصل کریں کیونکہ
خدا اور رسول نے بڑی شدت سے حکم فرمایا ہے کہ مومن
کی زندگی کا کوئی پہلو اس کی حیات کا کوئی لمحہ خلافِ
شریعت نہ گزرے اب غور طلب سوال یہ ہے کہ مومن
اپنے اس مطلوب و مقصود کو کس طرح حاصل کرے جب
کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید و حدیث شریف میں بعض
احکام ایسے ہیں جن کا سمجھنا ہر کسی کا کام نہیں چہ جائیکہ
ان سے احکام کا استخراج و استنباط کرے اس لئے کہ
کلام اللہ شریف بلاغت کے بلند معیار پر ہے جس کے

آگے کچھ نہیں اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ و
سلم کا کلام مبارک بھی بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے
نیز یہ ہر ذی بزرگ کلام مختلف انواع و اقسام پر مشتمل
ہیں ہر ایک کو جاننا اس کے مطابق حکم کرنا ان میں
باہمی فرق و امتیاز کرنا ہر کسی کا کام نہیں نیز قرآن مجید
اور حدیث شریف میں احکام اس ترتیب سے نہیں
جیسے کہ کتب فقہ میں مدون ہیں کہ جب بھی ضرورت پیش
آئے باب نکالے اور مسئلہ معلوم کرے۔ عام عقل انسانی
اس قابل نہیں کہ ان جزئیات کا ادراک کر سکے اور اس
کی حکمتیں و مسائل براہ راست سمجھ سکے اگر ایسا ہوتا تو وہ
واقعہ رونما نہ ہوتا جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوا کہ
جب یہ آیت نازل ہوئی کہ کلوا واشربوا حتی
یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود
من الفجر۔ تو عدی بن حاتم صحابی ایک کالا اور
سفید تاگا اپنے تکیہ کے نیچے رکھے اور انتظار کرتے لگے
جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو
آپ نے انہیں آیت کا صحیح مفہوم سمجھا دیا انما ھما سواد
اللیل و بیاض النہار۔ غور کرنے کا مقام ہے
جب وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آیت کا صحیح
مفہوم متعین نہ کر سکے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا
اور جنہیں اہل لسان ہونے کا ناز تھا تو عامۃ المسلمین کے
لئے کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ راست علماء کے ماخذ کے
بغیر اور کسی کی تقلید سے بے نیاز رہ کر اسلام کے مسائل اور
احکامات معلوم کر سکیں نیز قرآن مجید اور حدیث شریف
کے اکثر مسائل اصول و کلیات کی نوعیت کے ہیں
ان میں تا قیامت پیش آنے والے تمام مسائل و واقعات

کو بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کا جواب ان ہی میں مخفی رکھا گیا ہے
ان تمام چیزوں پر غور کرنے کے بعد صرف دو صورتیں رہ جاتی
ہیں ایک یہ کہ ہر شخص مجتہد بنے اور ہر ضرورت کو اپنے اجتہاد
سے حل کرے۔ جیسا کہ اکثر محدثین کرام و دیگر ائمہ کرام کا مسلک
رہا ہے۔ بصورت ثانی تقلید اختیار کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ
کا ارشاد ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا
تعلمون۔" اس آیت میں بھی صرف دو ہی صورتوں
کو واضح فرمایا گیا اگر خود عالم ہیں تو اپنے علم کے مطابق کرے
بصورت دیگر اہل علم سے سوال دریافت کریں ظاہر ہے کہ
دریافت و سوال برائے سوال نہیں ہو سکتے بلکہ عمل ہی کے
لئے ہوں گے ایسی صورت میں غیر عالم عالم کا مقلد ہوگا۔
اس آیت کریمہ سے غیر مجتہدین کو مجتہدین کی تقلید کا وجوب
معلوم ہوتا ہے کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے۔ اگر خود بھی عالم
نہ ہو اور نہ اہل علم کی تقلید بھی نہ کرے تو ظاہر ہے کہ اس کا
عمل اتباع ہوی کے تحت ہوگا جس کی مذمت کی گئی اور
ضلالت سے تعبیر کیا گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
" اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر
منکم" یعنی تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول خدا
کی اور تم میں کہ صاحبان امر کی اطاعت کرو۔ اس آیت
کریمہ میں صاف طور سے حکم دیا گیا کہ اصحاب امر کی اطاعت
کی جائے ظاہر ہے کہ اصحاب امر قرآن مجید اور حدیث
شریف میں موجود احکام کا امر کریں گے یا احکام موجود
نہ ہونے کی صورت میں استخراج و استنباط کے ذریعہ
دریافت کرکے امر کریں گے اگر ایسا نہ ہوتا کہ کسی کو
استنباط و استخراج کے ذریعہ احکام بیان کرنے کی اجازت نہیں
ہوتی بلکہ احکام موجود ہی کو بیان کیا جائے اور غیر موجود

میں سکوت اختیار کی جائے تو صرف اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کہنا کافی تھا۔ اولی الامر منکم کا مطلب یہ ہے کہ صاحبان امر جس کسی مسئلہ میں جو بھی حکم دیں ان کی تقلید کی جائے۔ بشرطیکہ وہ امر خلاف شریعت مطہرہ نہ ہو ان ہر دو آیات کریمہ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً ان سے تقلید تو ثابت ہو رہی مگر تقلید مطلق۔ نہ کہ تقلید شخصی آج کل رواج تقلید شخصی کا ہے نہ کہ تقلید مطلق کا۔ تقلید شخصی کوئی بدعت نہیں بلکہ سنت ہے اگر نگاہ حق پسند ہو نیز طالب صداقت ہو تو تمام حقائق عیاں ہو جاتے ہیں تقلید شخصی کو بدعت کہنے والوں کے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ فرامین مبارکہ بھی ہیں جو آپ نے حضرت سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو والی یمن بنا کر روانہ فرماتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ معاذ بتلاؤ جب کوئی حاجت پیش آئے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے آپ نے عرض کیا کتاب اللہ میں دیکھوں گا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا کہ اگر تم کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو کیا کرو گے آپ نے عرض کیا سنت کو دیکھوں گا پھر حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اس میں بھی نہ پاؤ تو کیا کرو گے آپ نے عرض کیا میں اجتہاد کروں گا اس پر حضور اکرم نے خدائے تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے رسول کو ہدایت عطا فرمائی، غور طلب مقام ہے کہ حضرت سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو فیصلہ اپنے اجتہاد اور رائے سے فرمائے تھے اور اہل یمن نے ان میں جو آپ کی تقلید و پیروی کی ہے بتلائیے کہ آیا وہ تقلید شخصی تھی یا تقلید مطلق۔ نیز ان کا یہ عمل برحق تھا یا نعوذ باللہ کچھ اور پھر احادیث شریفہ میں یہ بھی آیا ہے کہ حضور نے مختلف مقامات پر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو معلم بنا کر روانہ فرمایا ہے ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگ اپنے اپنے معلم کی تقلید کیا کرتے تھے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مذکورہ احادیث مبارکہ موضوع ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ حکم نہ فرمایا کہ تم اپنی طرف سے اجتہاد نہ کرو۔ بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار خوشنودی فرمایا نیز اکثر امت نے تقلید شخصی پر اتفاق کیا ہے سواد اعظم کی تقلید ضروری ہے تقلید شخصی کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

مذکورہ بالا دلائل و براہین سے تقلید شخصی بدعت نہیں بلکہ سنت ہے اور غیر مجتہد کے لئے تقلید واجب ہے ابتداءً یہ حال رہا کہ جو شخص جس کسی امام کا معتقد ہو جاتا وہ انہیں کے مجتہدات پر پابند رہتا لیکن رفتہ رفتہ لوگوں میں آزادی افکار کا جذبہ پرورش پانے لگا اور نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوا تو انہوں نے جس مجتہد کے مسائل میں سہولت و نرمی دیکھی تو اسے لے لیا اور کسی دوسرے مسئلہ میں دوسرے کی تقلید کرنا شروع کردی جب یہ وبا خطرناک حد تک بڑھ چکی تو جمہور اہل علم نے اس بات پر اجماع کیا کہ ائمہ اربعہ کے علاوہ کسی اور کی تقلید نہ کی جائے اور کسی ایک امام

(بقیہ سلسلہ صفحہ (۹) پر

زکوٰۃ ادا کرنے کے آداب

مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب مرحوم سابق مفتی جامعہ نظامیہ

زکوٰۃ بھی ایک عبادت ہے اور اس عبادت کو بجالانا بہرحال اجر عظیم کا باعث ہوگا مگر ان باتوں کی نگہداشت زکوٰۃ کے اجر و ثواب میں کئی درجہ اضافہ کرے گی۔

سب سے مقدم یہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرتے وقت نیت صاف رکھیں، ادائے زکوٰۃ کو محبوب حقیقی کے حکم کی تعمیل اور اسکی خوشنودی کا باعث سمجھیں، اس بات کا خیال نہ کریں کہ ہمارا مال ہمارے ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ایک مومن کو خدا کا سچا عاشق ہونا چاہئے اور حقیقی سچا عاشق وہی ہے جو اپنے جان و مال کو اپنا نہ سمجھے بلکہ معشوق ہی کی ملکیت ٹھہرائے اور جبکہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ زکوٰۃ میں دیا ہوا مال سیدھے اللہ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو ایک عاشق کے لئے اس سے بڑھ کر اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی ہی چیز اسکے معشوق کے پاس پہنچ گئی اور معشوق نے برضا و رغبت قبول فرمالی بلکہ درحقیقت اسی کی چیز تھی اسی کو پہنچ گئی مگر معشوق ایسا مہربان ہے کہ اس کو ہدیہ فرض کرتا ہے اور اسکے بدلہ میں کثیر نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے اگر ہم باوجود دعوائے عشق کے معشوق کا حق پہچاننے میں گریز کریں اور سنگدل و بخیل بن جائیں تو ہمارا دعویٰ سراسر جھوٹا ہے لیکن معشوق پر تو جان و مال سب فدا ہونا چاہئے اور اسکا ثبوت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دیا تھا کہ جان جہاد کیلئے وقف کر دی تھی اور اسی کی راہ میں ساری پونجی پیش فرمادی تھی ایسا ہی عشق کامل اور سچا کہلایا جاسکتا ہے۔ اس کمال محبت کو پیدا کرنیکے لئے ابتدائی درجہ میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے تاکہ اس ایثار کی عادت پڑ جائے تو پھر رفتہ رفتہ اس کی محبت میں سب چیزیں ہیچ نظر آنے لگیں گی پس جو کچھ مال زکوٰۃ میں دیا جائے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ صرف راہ محبت میں صرف ہوا اور یہ زکوٰۃ تو ایک آخری حد ہے۔ راہ محبت میں جس قدر زیادہ صرف کیا جائے اسی قدر محبوب کی قربت حاصل ہوگی۔

دوسری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جتنی جلد زکوٰۃ ادا کردی جائے افضل ہے۔ وجوب ادا کیلئے سال ختم ہونے کا انتظار ضروری نہیں سال گزرنے پر تو ادا کرنا واجب ہی ہو جاتا ہے اور اس وقت مجبوراً ادا کرنا ہوگا لیکن اس سے پیشتر ادا کردی جائے تو فرض بھی پورا ہوگا اور دلی شوق و رغبت کا بھی ثبوت ملیگا جو محتاجوں اور مستحقین کی خوشنودی کا باعث بھی۔ وہ انسان جو زکوٰۃ کیلئے ختم سال کا انتظار کرتے ہیں قبل از وقت مل جانے تو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ محتاجوں کا حد درجہ خوش ہو جانا ہی صدقہ و خیرات کی بڑی خوبی ہے کیونکہ وہ جتنا زیادہ خوش ہونگے اتنا ہی زیادہ ہمارے لئے باعث ثواب ہوں گے۔ کار خیر میں جتنی عجلت کی جائے افضل ہے ممکن ہے کہ تاخیر کی صورت میں ایسے مواقع پیش آجائیں کہ زکوٰۃ ادا نہ ہوسکے۔ جو فرصت مل جائے اسکو غنیمت تصور کرے کیونکہ زمانہ آفتوں و مصیبتوں سے پر ہوتا ہے

کیا یہ یقین ہے کہ آج ہم زکوٰۃ ادا کر سکتے ہیں تو کل بھی یہ ممکن ہوگا اور پھر اگر ہمارے ارادوں و نیتوں میں ہی کل کچھ فتور پیدا ہو جائے تو وہ زیادہ خسارہ کا باعث بن جائیگا اسلئے جو خیر و برکت آج مل سکتی ہے وہ فوری حاصل کر لینی چاہئے پس جو مال کو کچھ دنوں بعد لازمی ہو جاتا ہے بلکہ پیشتر ہی دینے میں خداوند قدوس کے انعام و اکرام حاصل ہو سکتے ہیں تو ضرور قبل از قبل دیدینا چاہئے۔ نیکیوں کو جمع کرنے میں زیادہ حریص بنے وہی دار آخرت میں زاد راہ ہونگی۔

تیسرے اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ حتی الامکان صدقہ زکوٰۃ پوشیدہ طور پر دیں۔ یہی خلوص نیت کی نشانی ہے اور فساد ریا سے بچنے کا واحد ذریعہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل ترین صدقہ و زکوٰۃ وہ ہے جو ایک تنگ دست ایک فقیر کو پوشیدہ طور پر دیا جائے۔ جو عمل خیر پوشیدہ طور پر کیا جاتا ہے اللہ پاک بھی اس کو خصوصی طور پر رازداری کے ساتھ لکھدیتا ہے اور اگر بندہ خود اس کو ظاہر کر دے تو اللہ جل شانہٗ بھی اس کو راز کی کتاب سے نکال کر اعمال ظاہر میں درج کر دیتا ہے اور پھر اگر اس نے اپنے عمل کا چرچا کیا اور اپنے خیر کا اوروں سے ذکر کیا تو اللہ پاک اس کے عمل کو راز اور ظاہر دونوں سے خارج کر دیتا ہے اور ریا و نمائش کے رجسٹر میں لکھدیتا ہے پس اگر اللہ پاک کی خاص راز کی کتاب میں اپنے اعمال کو درج کرانا چاہتے ہو تو اپنے اعمال حسنہ کو خود بھی پوشیدہ رکھو۔

حدیث شریف ہے صدقۃ السر تطفی غضب الرب پوشیدہ خیرات خدائے برتر کے غصہ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔" خدا جانے کتنے اعمال ہم سے رات دن ایسے سرزد ہوتے جو اللہ جل شانہٗ کے نافرمانی و ناخوشنودی کا باعث ہونگے اے حضرت انسان! آج خدا کے غضب اور غصہ سے بچانے میں اگر کوئی واحد قوت کام کر سکتی ہے تو صرف وہ ایسا ہی صدقہ و زکوٰۃ و ہر فعل ہے جو رازداری کے ساتھ کیا گیا ہو۔ اسی لئے بزرگان دین اپنی خیرات و کرم کو پوشیدہ رکھنے میں انتہا درجہ کی احتیاط ملحوظ رکھتے تھے۔ حضور اکرم نے فرمایا کرتے تھے کہ اتنی احتیاط کرو کہ سیدھے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو تک خبر نہ ہو۔ اکثر بزرگان دین اپنی صدقات وغیرہ اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں دیتے تھے بلکہ کسی رازدار کے تفویض کر دیتے تھے کہ وہ محتاجوں میں تقسیم کر دے تاکہ محتاجوں کو تک علم نہ ہو، یا نابیناؤں کو دیتے تاکہ وہ نہ پہچان سکے یا اندھیرے میں دیتے تاکہ لینے والا دینے والے کو نہ دیکھ سکے اکثر حاجتمند کو جب وہ سوتے رہتے تو ان کے یہاں رکھ دیتے یا ان کے دامن سے باندھ دیتے جب وہ بیدار ہوتا تو معلوم نہیں رہتا کہ اس کا محسن کون ہے ایسا ہی حسن طریقہ خیرات ریا سے محفوظ رکھتا ہے۔

ریاء ایسی صفت جو لوگوں کو دکھلانے کیلئے کوئی نیک کام کیا جائے جس میں نیکی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اوروں کو یہ جتلانا مقصود ہوتا ہے کہ ہم نے فلاں نیک کام کیا کیسے سامنے نہ کیا ہو مگر یہ خواہش ہو کہ کسی طرح لوگ اس سے واقف ہو جائیں یا اگر یہ خواہش بھی نہ ہو مگر جب کسی طرح اوروں کو ہمارے کار خیر کا علم ہو جائے اور ان کے اس جان لینے پر ہم کو خوشی ہو تو یہ بھی ریاء ہے اور جبکہ مقصود بالذات خدا کی خوشنودی نہ ہو بلکہ اوروں کو دکھانا اور ان کے دل میں اپنی عزت و عظمت قائم کرنا ہو تو جو نیت ہوگی وہی ثمرہ ملیگا یعنے ایسے دکھاوے کے کاموں سے مخلوق کی نظروں میں چاہے جتنی عظمت و وقعت پیدا ہو جائے کسی حال میں بھی ذرہ برابر کے لئے بھی خدا کی خوشنودی حاصل نہیں ہو سکتی خصوصاً ایسی عبادتوں میں جو خداوند قدوس نے

فرض کی ہیں ریاء کا شائبہ تک نہ ہونا چاہئے فرائض
کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور جب اس کے
ساتھ کچھ اور بھی مقصود ہو تو حق فرضیت ادا نہ ہوگا
اللہ پاک دلوں کی نیت کو پرکھتا ہے اور انہیں اعمال
کو پسند کرتا ہے جو خالص نیت سے کئے گئے ہیں۔
زکوٰۃ میں ممکن ہو ریاء کا میل شامل ہو جائے اور
خلوص نیت باقی نہ رہے اسمیں ایک خوبی یعنی پوشیدہ
دینے میں یہ بھی ہے کہ اکثر محتاجوں اور مستحقین
زکوٰۃ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خاندانی شرافت
اور عزت و آبرو کے لحاظ سے چار لوگوں کے سامنے
دست سوال پھیلانے سے عار کرتے ہیں بلکہ بلا مانگے
بھی کوئی دے تو اوروں کے روبرو لینے سے حجاب
کرتے ہیں۔ پوشیدہ طور پر اگر دیا جائے تو ان کے
عار و ننگ کا باعث بھی نہیں ہوتا اور زیادہ تر ایسے
ہی مستحقین کو زکوٰۃ دینی چاہئے۔ جو ذلیل طبیعت کے
نہ ہوں اور ان کی شرافت ان کو سوال کرنے سے باز
رکھتی ہے مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ نفس اتنا پاک
ہے کہ ریاء کا گزر ہی نہ ہو سکے کہ اس بات کا خوف نہ ہو کر
خلوص نیت میں کوئی فرق آئے تو زکوٰۃ بظاہر بھی
دے سکتے ہیں بلکہ اگر یہ توقع ہو اور یہی مقصود ہو
کہ لوگ ہم کو زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے دیکھ کر خود بھی ادائیگی
زکوٰۃ کی طرف مائل ہونگے اور اس طرح ایک اچھا نتیجہ
نکلے گا تو ضرور بضرور ظاہری طور پر بھی زکوٰۃ دینا افضل
ہے مثلاً اگر سائل مستحق نے اوروں کے سامنے بھی
سوال کیا تو صرف اس خیال سے کہ اور لوگ موجود ہیں
سوالی کرنے کی فضیلت سے باز رہنا چاہئے
بلکہ اپنی نیت کو ریاء سے پاک رکھتے ہوئے جو کچھ دینا

مقصود ہو دے دیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
ان تبدوا الصدقٰت فنعما ھی وان تخفوھا
وتؤتوھا الفقراء فھو خیر لکم ویکفر عنکم
سیئاتکم واللہ بما تعملون خبیر ہ اگر تم خیرات
کو ظاہر طور پر دو اچھا ہی ہے اور اگر اس کو چھپاؤ
اور محتاجوں کو دیدو تو یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔
اور تم سے گناہوں کو پاک کرتا ہے اور اللہ تم جو کچھ
کرتے ہو اس سے واقف ہے۔ پوشیدہ دیں تو بھی
وہ جانتا ہے اور اس کا اجر دیتا ہے اور بظاہر
دیں تو بھی وہ جانتا ہے اگر نیت پاک ہو اور خالصتاً
للہ ہو تو وہی ثواب ملیگا۔ مختصر یہ کہ ہر حال میں نیت
اچھی ہونی چاہئے اور مصلحت وقت بھی۔ اگر پوشیدہ
پن ہی احتیاط کا مقتضی ہو تو ضرور چھپائیں اور اگر
اظہار باعث ترغیب و تحریص ہو تو اظہار ہی بہتر ہے
چوتھی اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ صدقہ، زکوٰۃ دینے
کے بعد کبھی کوئی احسان نہ جتلائیں اور صدقہ و زکوٰۃ
لینے والے کو کسی طرح سے کوئی رنج نہ پہنچائیں۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا تبطلوا صدقٰتکم بالمن والاذیٰ
اپنے صدقہ و خیرات کو منت رکھ کر اور ایذا پہنچا کر
باطل مت کرو۔" مطلب یہ نکلا کہ خیرات دینے کے
بعد کسی وقت احسان جتلائیں تو وہ خیرات ہی
کوئی چیز نہیں۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا "لا یقبل اللہ
صدقۃ منان" اللہ احسان جتانے والے کے
صدقہ و خیرات کو قبول ہی نہیں کرتا۔" اور جب بارگاہ
خداوندی ہی قبول نہ فرمائے تو وہ باطل ہی ٹھہرا۔
منت رکھنا یہ ہے کہ اپنی عطاء کا ذکر و چرچا کریں
دعا کے طالب ہوں، اپنی توقیر و تعظیم پر مجبور کریں۔

اس کی اصل یہ ہے کہ دینے والا دیتے وقت
صرف یہ سمجھے کہ وہ جو محتاج کو دے رہا ہے تو اس
پر احسان کر رہا ہے اور اپنی نعمتیں اس کو سونپ رہا
ہے۔ حالانکہ محتاج ہی کا احسان ہے کہ وہ اللہ
پاک کے حق کو لے رہا ہے اور اسطرح آپ کو ایک
قرض سے سبکدوش کر رہا ہے۔ فرض کیجئے کہ محتاجوں
نے آپ کے صدقہ و زکوٰۃ قبول نہیں کیا پھر کیا صورت
ادائے قرض کی ہو سکتی ہے اور اگر حقیقت کی
نظر سے دیکھا جائے تو زکوٰۃ اللہ پاک کا ہی حق ہے
آپ نے اللہ کو دیا اور اس نے اس محتاج کو
تو آپ کا اس محتاج پر کوئی احسان نہیں ہوا۔
حضور اکرمؐ فرمایا کرتے تھے صدقہ سائل کے ہاتھ
میں پڑنے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے
تمام مخلوق کو رزق پہنچانے والا وہی ایک خدائے
برتر ہے، محتاجوں کو اس طرح پہنچایا کہ دولتمندوں
سے لیا اور انہیں دے دیا۔ دولتمندوں کو بھی خود اسی نے
دیا تھا۔ جس میں سے ایک خفیف حصہ لے کر ان کیلئے
ثواب آخرت کی سبیل نکالی اور محتاجوں کو ان کا
رزق بقدر ضرورت پہنچا کر باقی دار آخرت کیلئے
محفوظ رکھا۔ جب اتنا سمجھ لیں تو پھر صدقہ دے کر
احسان جتلانے اور فخر کرنے کا کوئی موقع نہ ملیگا
صدقہ کی حقیقت سے لاعلمی ہو تو ہی نفس احسان
و منت کا خیال کر سکتا ہے۔ دے کر احسان جتانا
برا ہے مگر یہ بہت برا ہے کہ صدقہ لینے والا رنج میں
مبتلا ہو۔ اس طرح کہ سائل کو جھڑکی دیدی یا
اسکے سخت کلامی سے پیش آئے اور اس کو ذلیل
و رسوا سمجھا یا اگر وہ پوشیدہ طور پر مانگ رہا ہے تو
اسکو ظاہر کر کے اس کا ننگ و عار کا باعث بنے
یہ تو محض بخل کی وجہ سے کیا جاتا ہے کہ جی دینا نہ
چاہتا ہو تو سائل کو جھڑکی دے کر یا رسوا کر کے نکال
دیا، دوسرے اگر خود مالدار ہیں تو محتاج کو ذلیل اور
کمتر درجہ کا سمجھ کر یہ سلوک کیا جاتا ہے۔ ان دونوں
کا سبب جہل و گمراہی ہے۔ اپنی دولت و نعمت کا
ایک قلیل و ناچیز حصہ حاجتمند کو دینے میں اگر
بخل کیا جائے تو ایسی صورت میں کہ اللہ پاک اسکا
ہزار درجہ ثواب دینے کا وعدہ فرمایا تو یہ عین
حماقت ہے۔ یہ بھی خالی از حماقت نہیں کہ اگر دولتمند
ہیں تو خود کو اشرف و اعلیٰ سمجھیں اور غریبوں سے نفرت
کریں اور انہیں ذلیل شمار کریں۔ بزرگی و عزت صرف
اعمال و نیت پر موقوف ہے نہ کہ دولت پر۔
ان اکرمکم عند اللہ اتقکم اللہ کے پاس
اسی کو سب سے زیادہ عزت اور بزرگی کا درجہ ملتا ہے جو
سب سے زیادہ نیکوکار و پرہیزگار ہو جو انسان کہ مالی حیثیت
سے محتاج ہیں مگر صبر و رضا کے ساتھ بسر کر رہے ہیں انہیں
جو مدارج عطا کئے گئے ہیں ان کے مقابلہ میں دولتمندوں
کی عزت و حرمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دولت کے ساتھ
ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں تو فضیلت فخر حاصل نہیں ہوتی
دولتمند لوگ فقراء و مساکین کے بعد جنت میں داخل
کئے جائیں گے اور یہ فضیلت کوئی معمولی نہیں۔ ایک وقت
حضور اکرمؐ نے فرمایا ھم الاخسرون ورب الکعبۃ
قسم ہے رب کعبہ کی کہ وہی خسارہ میں ہیں۔ حضرت ابوذرؓ
اس وقت موجود تھے انہوں نے پوچھا کون لوگ "
آپؐ نے فرمایا ھم الاکثرون اموالا وہی
لوگ جو زیادہ مال رکھنے والے ہیں۔ یہاں نسبتاً"

بیان کیا گیا مال رکھنے والوں کی نسبت زیادہ مال
رکھنے والے ضرور خسارہ میں ہیں اور یہ دار آخرت کے
اعتبار سے کہ چند روزہ زندگی تو دولت کے نشہ میں
عیش و آرام لہو و لعب میں گزر جاتی ہے مگر دولت کا نشہ
وقت دار آخرت میں پہنچانے کا موقع نہیں دیتا اور
جو انسان اس فتنہ سے دور ہیں یعنی مال نہیں رکھتے ان
کیلئے یہ دشواری نہیں رہتی اسی لئے حضرت امجد فرماتے ہیں

دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے
ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی
بے فکری کا سونا بھی بڑی دولت ہے

اور جو دولتمند اس حقیقی عزت کو سمجھ پاتے ہیں وہ کبھی محتاجوں
کو حقارت و ذلت کی نظر سے نہیں دیکھتے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مثل الذین ینفقون اموالہم فی
سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل
فی کل سنبلۃ مأۃ حبۃ واللہ یضاعف
لمن یشاء واللہ واسع علیم ۝

جو لوگ کہ اپنے اموال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کی
مثال ایسی ہے کہ ایک بیج بویا اور اسکے سات بال اگ آئے
اور ہر بال میں سو سو دانے ہیں اور اللہ جسکے لئے چاہتا ہے
اس سے بھی دگنا کر دیتا ہے اور اللہ وسعت رکھنے والا اور علیم ہے
یہ وہی صدقہ ہے جو مال طیب سے خوش دلی کے ساتھ صرف
اللہ کی محبت میں دیا جائے کہ اس صدقہ کو اللہ تعالیٰ
کاشت کرتا ہے اور اس کاشت میں ایک دانہ کے سو
دانے ہو جاتے ہیں بلکہ وہ چاہتا ہے تو اس سے بھی زیادہ
اگاتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ دینے کے بعد احسان نہ جتلایا
گیا ہو اور اس کو رنج نہ پہنچایا گیا ہو پھر ارشاد ہوتا ہے

الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ
ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی لہم
اجرہم عند ربہم ولا خوف علیہم ولا ہم
یحزنون ۝ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں دیتے
ہیں اور پھر جو کچھ کہ دیا ہے اسکے بعد منت نہیں رکھتے
اور نہ کوئی اذیت و رنج پہنچاتے ہیں ان کیلئے ان کے
پروردگار کے پاس ان کا ثواب ہے ان کیلئے کوئی
خوف کی بات نہیں ہے اور نہ انہیں کسی بات کا رنج ہے"
پس ایسے ہی صدقہ کو مستحق قرار دیا ہے جسکے پیچھے احسان
نہ ہو اور جب ایسا صدقہ دیا ہو تو پھر وہی صدقہ تمام
بلاؤں کے لئے سپر بن جاتا ہے حتیٰ کہ دار آخرت میں
خوف و حزن کو دور کر دیتا ہے۔

یاد رہے کہ صدقہ دینے سے محتاج کی حاجت روائی
ہوتی ہے اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے جو خوشنودی
خدا کا موجب ہے مگر جب احسان رکھ کر یا سخت سست
کہہ کر یا کسی اور طرح برا سلوک کر کے اسے رنج پہنچایا
اس کو ناراض کر دیا تو اس میں بھی ریا کی مانند مقصود
خوشنودی خدا نہ ہوگا۔ اور جب خوشنودی خدا حاصل
نہ ہوگی تو گویا یہ احسان یہ برا سلوک ایسا مینہ ہے جو
کھیتی کو تباہ کر دے۔ اس کے بعد ان لوگوں کی کچھ مثال
دی گئی ہے جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنیکے لئے خلوص
نیت سے صدقہ دیتے ہیں اور ایسا صدقہ دینے والا
کبھی احسان نہیں رکھتا کیونکہ وہ حقیقت صدقہ و
زکوٰۃ کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ایسے صدقہ و زکوٰۃ کا یہ
اجر خیر ملتا ہے کہ گویا اونچی ٹیلہ دار زمین پر کھیتی کی ہے
کہ تھوڑا سا مینہ برس جائے تو بھی زراعت کے لئے
کافی ہے اور اگر خوب برسے تو اور بھی زیادہ فائدہ ہے

کوئی نقصان نہیں اور کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کام نیک ہے، غرض نیک ہے، نیت نیک ہے تو ضرور بالضرور اجر بھی نیک ہوگا یقیناً ہوگا۔ اللہ کبھی ظلم نہیں کرتا ہر شخص کا حق وہ اس کو پہنچا دیتا ہے۔

آداب زکوٰۃ کی پانچویں شرط یہ ہے کہ اپنے صدقہ و عطیہ کو ہمیشہ کم سمجھیں یعنی جو کچھ دے رہے ہوں اس کو زیادہ نہ خیال کریں اور اس سے زیادہ دینے کو اچھی سمجھیں، اپنی عطا کو خود ہی عظمت دیں تو ضرور فطرۃً نخوت پیدا ہوگی یہ خیال کہ ہم نے محتاج کو اتنا کچھ دیا ہے فخر پیدا کرے گا اور کبر و غرور ایمان کے حق میں زہر کا حکم رکھتے ہیں۔ جب ہمارا یہ ایمان ہیکہ اللہ ہی کو بزرگی ہے اور اسی کو غرور سزاوار اور بندہ ہر طرح عاجز و ذلیل ہے تو ہمارا کسی امر پر بھی غرور کرنا اور اپنی بزرگی کا احساس کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی تو جتنی بندگی کیجائے کم ہے۔ زکوٰۃ بھی ایک تعمیل حکم ہے اسکی ادائی کوئی بڑی بات سمجھنا اور اس پر فخر کرنا حق بندگی کے خلاف ہے اپنی طاعت و فرمانبرداری کو جتنا کم سمجھے اللہ تعالےٰ کے پاس اس کی وقعت زیادہ ہوتی ہے اسلئے کہ یہ جب ہی ہوتا ہے جب کہ خدا کی عظمت ہمارے پیش نظر ہو کہ اس کے مقابلہ میں ہماری بڑی سے بڑی عبادت و طاعت کوئی مقام نہیں رکھتی اور جب اس کا احساس ہو تو ہم اپنی کسی طاعت کو بڑی نہ سمجھیں اور یہی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور اسی سے ہماری نیکیاں اس کے پاس زیادہ وزنی اور قابل توجہ قرار پاتی ہیں۔ اس طرح گناہ کو ہم اپنے پاس جتنا اہم سمجھیں اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا وزن کم ہوتا ہے کیونکہ ہم کو خداوندقدوس کا جتنا زیادہ خوف ہوگا اس کی نافرمانی اتنی ہی زیادہ و قبیح ہوگی اور ایک معمولی گناہ بھی ہماری نظروں میں زیادہ ہیبتناک دکھائی دے گا چہ جائیکہ بڑا گناہ۔ ہم اپنے گناہ کو جتنا بڑا اور اہم سمجھینگے اتنی ہی زیادہ ندامت ہوگی۔ اور اتنی ہی زیادہ توجہ اور خلوص سے ہم توبہ اور استغفار کرینگے اس کے بعد ارحم الراحمین کیلئے کیا دشوار رہا ہے کہ ہماری غلطیوں سے درگزر کر جائے۔ پس ہر وقت اپنے برے فعل کی ندامت دامنگیر رہنی چاہیئے۔ اور اچھے کاموں پر غرور و نخوت کبھی نہ ہو۔ خصوصاً زکوٰۃ کی ادائی کو بڑی بات سمجھنا اور اس پر غرور کرنا کسی طرح بھی زیب نہیں دیتا۔

چھٹی شرط آداب زکوٰۃ سے یہ ہے کہ جو چیز اللہ کی راہ میں دیں وہ اچھی، پاک اور بے عیب ہو۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاکی ہی کو پسند کرتا ہے۔ جو چیز کہ پاک و صاف نہ ہو اسکی بارگاہ میں ہرگز ہرگز قبول نہیں ہوتی۔ ایک مہمان آپ کے پاس آئے تو آپ اپنی حیثیت سے زیادہ ہی اپنے پاس کی بہترین چیزوں سے اس کی ضیافت کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کوئی چیز خداوند قدوس کی بارگاہ میں پیش ہوتی ہے تو وہ بھی ضرور بہترین و اعلےٰ و ارفع ہونی چاہیئے۔ اس کی بجائے اگر ناقص مال زکوٰۃ میں نکالا جائے یا صدقہ میں دیا جائے تو قبولیت کی توقع بیجا ہے۔

حضرات کرام! صدقہ و زکوٰۃ دیتے وقت ان چھ باتوں کو ضرور ملحوظ رکھیں ورنہ مال جانے پر بھی آخرت کا ثواب نہ ملے تو خسر الدنیا و الاخرۃ یعنی دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ کا باعث ہوگا۔

مصارف زکوٰۃ کے تحت جن کو مستحق زکوٰۃ و صدقہ قرار دیا گیا ہے مگر ان میں بھی خصوصیت سے دوسروں پر ترجیح رکھنے والے لوگ ہیں لہذا ان سب کو پہلے تلاش کر کے مال زکوٰۃ پہنچائیں۔ ان میں مقدم و مخصوص وہ بزرگوار ہیں جو عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہوں، جنہیں ذکر الٰہی سے ایک لحظہ کیلئے بھی دنیوی کاروبار کی طرف طبیعت مائل ہی نہ ہوتی ہو، حقیقت میں یہ خدا کے شیدائی ہوتے ہیں۔

خدا بھی انہیں محبوب رکھتا ہے، انکی نظر صرف خدا پر ہی ہوتی ہے، پس ان بزرگوں کے حوائج زندگی کو پورا کرنا عین خوشنودی خدا کو حاصل کرنا ہے، ان کے کھانے پینے کا انتظام کروانا انہیں طاعت خداوندی کیلئے تیار کرنا ہے۔ مگر آج کے اس فتنہ و بلا کے زمانہ میں نام کے صوفی اور طلب کے متوکل بہت سارے پیدا ہوگئے ہیں جنکی تلاش کیجائے گی انشاء اللہ اتنا اجر زیادہ دے گا ان ہی مخصوص لوگوں میں وہ بھی ہیں جو علم دین کے طلب میں مشغول ہیں، جیسے آج کی صد سالہ واحد دینی درسگاہ آندھرا پردیش جامعہ نظامیہ ہے جو حقیقت میں ہر صورت میں زکوٰۃ کی مستحق ہے۔ لہذا ایسا سوچ سمجھ کر اپنی زکوٰۃ اگر جامعہ نظامیہ میں صرف کریں گے تو یہ سونے پر سہاگہ ہوگا اور آپ کی بے لاگ خدمت کیونکہ ان کی حوائج زندگی کو پورا کرنا ان تحصیل علم میں مدد کرنا ہے اور علم دینی سے بڑھکر کوئی فضیلت نہیں، افضل ترین عبادت علم دین کی تحصیل ہے، عالم کا درجہ نبوت کے بعد ہی ہے اور کسی کو اس درجہ پر پہنچنے میں مدد کرنا ظاہر ہے کہ کیسے اجر عظیم کا باعث ہوگا

اسی طرح خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کی بھی تلاش کریں جن کی حاجتیں پوشیدہ ہیں۔ جو درحقیقت سخت احتیاج کی حالتیں ہوں، مگر غیرت و آبرو کے لحاظ سے مانگ نہ سکتے ہوں جو چاہے کئی دن سے فاقہ پر فاقہ گزار رہے ہوں لیکن ظاہری حالت میں فقیر و محتاج نہ معلوم ہوتے ہوں، لہذا ایسے محتاجوں کو تلاش کرکے پوشیدہ طور پر زکوٰۃ دی جائے، تاکہ ان کو ظاہری طور پر لینے سے رنج نہ پہنچے۔

اس طرح وہ لوگ بھی زکوٰۃ کے حقیقی مستحق ہیں جو کثیر العیال ہیں، ان کی ضروریات ہی ان کو تکلیف نہیں پہنچاتیں بلکہ اہل وعیال کی ضرورتیں بھی زیادہ ستاتی رہتی ہیں، اور وہ بسبب احتیاج ان کی سربراہی نہیں کرسکتے، ان کی حالت یقیناً واجب الرحم ہوتی ہے

آج کے اس زمانے میں فقیروں اور سائلوں کا گروہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اصل مستحقین کو خیرات کا ایک عشر بھی نہیں پہنچتا۔ گلی گلی کوچے کوچے گشت کرنے والے اتنا زیادہ وصول کرلیتے ہیں کہ اصل محتاجوں کے لئے باقی ہی نہیں رہتا، اور جو معذور ہیں اس کوشش کے ساتھ وصول بھی نہیں کرسکتے، اسلئے ہمیشہ خاص خیال رکھیں کہ ان مستثنٰی ہوں کو زکوٰۃ کا مال نہ دیں، بلکہ جن مستحقین کا ذکر کیا گیا ہے ترجیح دیں۔

جو آپ کے عزیز و اقارب ہوں، آپ کی مدد کے محتاج ہوں وہ سب سے زیادہ آپ کی زکوٰۃ کے مستحق ہیں، ان کے لئے یہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی چنانچہ حضرت علی رضؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے بھائی کی ایک درہم سے صلہ رحمی کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت کسی اجنبی کو بیس درہم دینے کے۔ اور حقیقت میں ایسا نہ کیا گیا تو ضرورتیں مجبور کریں گی تو غیروں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی نوبت آئے گی اور اس کا گناہ یقیناً ان دولتمندوں پر ہوگا، جو باوجود دولتمند ہونے کے اپنے عزیز و اقارب کو دست سوال کرنے پر مجبور کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام انسانوں کو ادائے زکوٰۃ کے برکات و فیوض سے ملک کی آفات و مصائب کے دور کرنے کا باعث بنے۔

والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین وعلی الملئکۃ المقربین وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم تسلیماً کثیراً دائماً الی یوم الدین۔

واللہ اعلم بالصواب

مطابقت اجزاء کلمۂ طیبہ

کلمۂ طیبہ جزو اوّل

لا الٰہ الا اللّٰہ

(۱) لا الٰہ الا اللّٰہ الوہیت

(۲) لا الٰہ الا اللّٰہ میں بارہ حروف ہیں

(۳) اللّٰہ میں چار حروف ہیں

(۴) اللّٰہ میں تیسرے حرف پر تشدید ہے

(۵) لا الٰہ الا اللّٰہ کے حروف بے نقط ہیں

(۶) لا الٰہ الا اللّٰہ کے حروف نوری کہلاتے ہیں

(۷) خدا کی صفت الوہیت و ربوبیت ہے

(۸) کلمۂ الوہیت میں اللّٰہ کے دو نام ہیں

(۱) اللّٰہ اسم ذاتی (۲) الٰہ اسم صفتی

(۹) جس طرح الوہیت میں اللّٰہ کے الٰہ واحد ہونے میں اقرار ضروری ہے

(۱۰) خدا رحمٰن ہے دونوں جہاں کا

کلمۂ طیبہ جزو دوم

محمد رسول اللّٰہ

(۱) محمدؐ الرسول اللّٰہ رسالت

(۲) محمدؐ الرسول اللّٰہ میں بارہ حروف ہیں

(۳) محمدؐ میں چار حروف ہیں

(۴) محمدؐ میں بھی تیسرے حرف پر تشدید ہے

(۵) محمدؐ الرسول اللّٰہ کے حروف بھی بے نقط ہیں

(۶) محمدؐ الرسول اللّٰہ کے حروف بھی نوری کہلاتے ہیں

(۷) محمدؐ کی صفت ربوبیت و عبدیت ہے

(۸) کلمۂ رسالت میں بھی محمدؐ کے دو نام ہیں

(۱) محمدؐ اسم ذاتی (۲) رسول اسم صفتی

(۹) اسی طرح رسالت میں محمد صلعم کے رسول آخر ہونے کا اقرار ضروری ہے

(۱۰) محمدؐ رحمت ہیں دونوں جہاں کے

محمد عثمان
کامل الفقہ (نظامیہ)

عصر حاضر میں علم دین کی اہمیت و ضرورت

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان ۞ والصلوٰۃ والسلام رسولہ المنان وعلیٰ آلہ واصحابہ الذین نشروا القرآن اللھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد وبارک وسلم

ہم غور وفکر کریں کہ اسلام میں علم کی کیا اہمیت ہے۔ و نیز ہمارے اسلاف کی شان و شکوہ جاہ و جلال کا کیا راز ہے۔ و نیز انہوں نے تحفظ دین و ارتقاء علم کے لئے کیا عملی صورت کی کہ جن کے ثمرات عمل سے آج تک ہم متمتع ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے اسلام نام خالص عقائد و اعمال صالحہ کا جس میں دیانت و معاملات و معاشرات اور اخلاق سب داخل ہیں اور عمل موقوف ہے علم پر۔ یقیناً اسلام حامی علم و برہان ہے۔ علم کی برتری پر آج تمام دنیا متفق ہے روح کو طبعاً سچی مسرت علم سے حاصل ہوتی ہے جو اس کا ربانی جوہر ہے نہ کہ خورد و نوش اور دیگر حسی لذات سے کیوں کہ حسی لذت ایک شعلہ ہے جو تھوڑی دیر بھڑکتا ہے لیکن غور و خوض کرنے والی روح جو حواس کی تاریک دنیا سے نجات پانے کی تمنا رکھتی ہے خالص نور ہے جس کی درخشانی دیرپا ہے۔ اسی لئے فلسفی موت سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ جب ندائے الٰہی اسے بلاتی ہے تو خوشی سے موت کا استقبال کرتا ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جس کی کتاب حمید کا آغاز بیان علم سے ہوتا ہے۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق ۞ خلق الانسان من علق اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم

یہ وہ آیات بینات ہیں جن کا نزول جملہ آیات قرآنیہ سے پہلے اللہ کے نبی و رسول پر ہوا۔ غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مذہب کی بنیاد اکتشاف علم پر ہے جو انسان کی کرامت و شان وجود علم سے بتایا ہے جو تحریر کو اشاعت علم کا صحیح ذریعہ ٹھہراتا ہے۔ قرآن کریم کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم کو کیا تعلیم دی گئی وہ یہ ہے کہ قل رب زدنی علماً کو اپنا ورد بنالیں اور نفس نفس زندگی کو ہر وقت فراوانی علم اور افزونی علم کا شائق و طالب اور ساعی اور راغب بنائے رکھیں۔ علم کا درجہ جو اسلام میں ہے وہ ایک معمولی سے فقہی مسئلہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اہل اسلام کے پاس کتا نجس العین حیوان ہے۔ لیکن جب وہی حیوان ما علمتم من الجوارح مکلبین کا مصداق بن جائے تب اس کا شکار حلال ہے۔ غور کریں کہ سگ پلید کا منصب کس نے بلند کیا۔ یہ ترقی علم ہی کے طفیل ملی ہے یہ تو ایک مثال ہے اور اس سے ترقیات روحانی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اسلام نے حصول علم کا جو شوق و رغبت دلائی ہے کہ ہر مسلمان کو شہد کی مکھی بن کر سب جگہ شہد علم فراہم کرنے کی اشارت فرمائی ہے وہ اس ارشاد سے ظاہر ہے۔ ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا۔

چنانچہ علم کو حیات اسلام فرمایا گیا۔ معلوم ہوا کہ اسلام جسد ہے اور اس کی روح رواں علم ہے۔ ہمارے اسلاف اس نکتہ نہاں سے واقف تھے اور وہ ہمیشہ اپنی روح کے ساتھ ساتھ مذہب کی روح کی ترقی میں کوشاں رہے۔

چنانچہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب علم ہماری نگاہوں کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا تو علم کی طلب میں خشکی کی مسافت اور تری کی ہولناکی ہماری ہمتوں کو پست اور ہمارے ارادوں کو کمزور نہ کرتی تھی۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کے خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا۔ ہماری پست ہمتی اور بے رغبتی کی وجہ سے عصر حاضر میں علم دین کا جو انحطاط ہو رہا ہے اس سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کی بقاء اسلام کی بقاء ہے۔ عصر حاضر میں علم دین کے تحفظ کے لئے ہم جتنے بھی ذرائع اختیار کریں کم ہیں۔ جیسا کہ ہم روز بروز دیکھتے آرہے ہیں۔ علم دین کی اہمیت ہم سے دور ہوتی جارہی ہے۔ رسول صادق کا قول آج صادق آرہا ہے۔ ھلاک امتی فی شیئین ترک العلم و جمع المال۔

یہ علم دین کا انحطاط ہمارے لئے ایک لمحہ فکر ہے اور ہمارے لئے غور طلب امر یہ ہے کہ ہم اس کی بقاء و ارتقاء کے فریضہ کو کس طرح انجام دیں گے۔ اسی مرض مہلک کو محسوس کرکے ہمارے اسلاف نے مدارس دینیہ کو قائم فرمایا تاکہ کفر و شرک ضلالت و جہالت کی تاریکیوں کا سد باب ہو سکے۔

چنانچہ جنوب میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حافظ محمد انوار اللہ صاحب فضیلت جنگ علیہ الرحمہ نے علم دین کی بقاء کے لئے جامعہ نظامیہ کی سنگ بنیاد رکھی اور دوسری طرف شیخ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی رح نے دیوبند کی بنا رکھی اور پھر تیسری طرف حضرت مولانا محمد علی مونگیری رح نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی بنا رکھی۔ نور اللہ قبورھم ونشر اللہ علومھم فی العالم۔ جو کہ آج اپنے اپنے مقامات پر علم کے انوار سے جہالت کی ظلمات کو دور کر رہے ہیں۔ اور بہت سارے حاملان دین طالبان علوم نبوت ان سے مستفید و سیراب ہو کر نکل رہے ہیں۔ اور اپنے ایمان سے عوام الناس کو سیراب کرتے جارہے ہیں۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس وقت علم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لئے ایک ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں اگر اس وقت اسلام کی بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہی مدارس ہیں۔

حضرت عمر فاروق رض نے اپنے صاحبزادے کو اپنے علم کا حقیقی وارث بنایا تھا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقیقی وراثت علم دین ہے نہ کہ خلافت۔ اس لئے کہ اللہ کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ الانبیاء لا یورثون دینارا ولا درھما بل یورثون العلم اور علماء ہی کو اپنے نائبین قرار دیا۔ العلماء ورثۃ الانبیاء اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رح نے امام ابویوسف رح اور امام محمد رح جیسے ناطق کتب کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس سے آج ساری دنیا مستفید ہو رہی ہے جس کی وسعت ہندوستان ہی میں نہیں دوسرے ممالک میں بھی ان کے مذاہب بلند کی جارہی ہیں

حجۃ الاسلام حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح جنہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے علم حدیث

کا درس دیا۔ شاہ صاحب کا سارا خاندان علم کا گہوارہ تھا۔ اس خاندان کے ہر فرد نے علم کے انوار کو لے کر جہالت کے ظلمات کو دور کیا اور تمام عالم میں علم کو منور کیا۔ اور تمام علوم میں امتیازی کمال حاصل کیا۔ مگر آج اس مادی ترقی کے دور میں علم دین کی بہت ضرورت ہے۔ آج سے چند سال پہلے ہندوستان میں بہت سے دینی مدارس قائم تھے اور اب صرف معدودے چند ہو گئے جن کا شمار انگلیوں پر ہو سکتا ہے۔ اور ان کی بھی یہ حالت کہ اگر دنیوی مدارس کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو ہر لحاظ سے کالعدم سمجھے جائیں گے اس سے ظاہر ہے کہ جو مذہب کس مپرسی کے عالم میں ہو اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ مذہب کی حفاظت و اشاعت اس زمانہ میں صرف علماء سے متعلق ہے۔ کیونکہ ہر مذہب و ملت والا شخص یہی چاہتا ہے کہ اس کا اپنا مذہب ترقی کرے۔

چنانچہ آریہ ملاحدہ وغیرہ کے عالم جاہلوں پر ان کے مذاہب کی خامی اور خرابی اور اپنے تہذیب کی عمدگی تحریر سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا جواب مذہب کی طرف سے نہ دیا جائے تو جہلاء تو کیا متوسط اور کم درجہ کے علماء متزلزل ہو جاتے ہیں۔ اگر اعلیٰ درجہ کے علماء مذہب میں نہ ہوں ہر قسم کے اعتراضوں کے جوابات دے سکیں تو ظاہر ہے کہ آریہ وغیرہ جو ہر فن میں کمال حاصل کئے ہوئے طرح طرح کے اعتراضات کر کے مذہب کو اہل مذہب کے خیال و ذہنوں میں بالکل بے وقعت بلکہ بے اصل ثابت کر دیں گے اسی وجہ سے حدیث میں ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم موت العالم ثلمة فی الاسلام۔ فرمایا رسول برحق نے کہ عالم کی موت دین میں رخنہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک اس عالم کا کوئی جانشین نہ ہو تو اس رخنہ کا انسداد نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ اس پر آشوب زمانہ میں علوم جدیدہ کی آندھی جو پرانے دینی خیالات کو درہم برہم کرنے والی ہر طرف سے اٹھ رہی ہے۔ آریہ ملاحدہ وغیرہ اعتراضوں کی بوچھار ہمارے دین و مذہب پر ہر طرف سے کر رہے ہیں۔ جن کے جواب سوائے چند علماء کے ہر عالم نہیں دے سکتا۔ ادھر مخالفین کی جماعتیں اپنی قومی سرمایہ داری سے ترقی کر رہی ہے۔ اور ہمارے سامنے مختلف ازمس آ رہے ہیں ایک طرف کمیونزم کا نعرہ تو دوسری طرف سوشلزم تو تیسری طرف اسپارلزم سیکولرزم کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ جو ہمارے مقدس مذہب کے افراد کو ہم سے چھین کر اپنے قبضہ میں لے رہے ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ اگر ہمارے علماء کرام جو وصال کر جاتے ہیں ان کی جگہ نہ ان کا کوئی نائب ہوتا نہ قائم مقام اور قوم کو اس کی فکر ہوتی ہے اگر یہی حالت اور چند روز رہے تو آئندہ ہماری آنے والی نسلوں کو ہمارے دین و مذہب پہنچنے کی کیا صورت ہوگی۔ عموماً قوم کی بے اعتنائی و بے رغبتی کی وجہ سے و عدم التفات ایسے ہی رہا تو خدانخواستہ وہ دن دور نہیں کہ زمانہ کی ستم ظریفی سے حیات اسلام یعنی علم مفقود ہو جائے تو خدا اور رسول کے سامنے سخت پشیمانی اور ندامت اٹھانی پڑے گی ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے مسلمانو ✤ تمہاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

اللہ تبارک و تعالیٰ کے قول "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ نے اس دین کی حفاظت کے لئے اپنی پوری ذمہ داری کا اظہار کیا لیکن اس کا ذریعہ اپنی تمام مخلوق سے بہترین

بندے یعنی علماء کو بنایا۔ آج ہم عالم دنیا پر طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کا تعلق صرف مسجد کی حد تک یا زیادہ وسعت نظری سے کام لیا تو انسان کی انفرادی زندگی تک محدود ہے۔ حالانکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جو ہر زمان و مکان اور ہر دور کا ساتھ دیتا ہے اور دنیا کا کوئی معاملہ کیوں نہ ہو جائے۔

اب زمانہ ماضی و حال کی طرف سرسری نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہو جائے گا کہ اس زمانہ میں ایک عالم کے جانشین اس کے صدہا شاگرد ہوا کرتے تھے اور اب جو مشہور اور دین کی خدمت و حفاظت کرنے والے علماء کا انتقال ہو جاتا ہے تو ان کا ایک بھی نائب نہیں رہتا حالانکہ مسلمانوں کو علماء کی اشد ضرورت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ ان مثل العلماء کمثل النجوم فی السماء یھتدی بھا فی الظلمات البر والبحر فاذا انطمست النجوم اوشاك ان یضل الھداة علما کی مثال ایسی ہے کہ آسمان میں ستارے جن سے جنگل اور سمندروں میں لوگ راستہ پاتے ہیں۔ اگر ستارے نہ ہوں جو لوگ راہ پر ہیں وہ بھی گمراہی و ضلالت کے گڑھے میں جا گرینگے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ علماء کے انفاس کی برکت ہے کہ ہر وقت جو شبہات اور وساوس شیاطین الجن والانس مسلمانوں کے دل میں ڈالتے رہتے ہیں وہ دفع ہو جاتے ہیں۔ اگر ان حضرات کی صحبت میسر نہ ہو تو اس تاریک زمانہ میں بہت سے لوگ گمراہ ہو جائینگے۔ تائید دین میں ان حضرات کی سعی محمود مجاہدوں کی کوشش سے زیادہ ہے کیونکہ مجاہدوں نے جو ملک اپنی جانبازیوں سے فتح کیا۔ علماء کی جانفشانیوں سے اس میں اسلام باقی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم مجاہد فی سبیل اللہ سے افضل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا العلم حیاة الاسلام وعماد الدین۔ یعنی علم اسلام کی حیات ہے اور دین کا ستون ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز سے اسلام کی حیات اور بقاء متعلق ہو اس سے عبادت کیونکر افضل ہو۔ کیونکہ کل عبادتوں کا دار و مدار اسلام ہی پر ہے۔ اور اسلام موقوف ہے علم پر۔ غرض علم کی فضیلت جس قدر بیان کی جائے کم ہے اور جو احادیث بیان ہوتی ہیں وہ سمندر سے قطرہ بھی نہیں۔ ان تمام سے آنحضرت کا مقصود ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں اہل اسلام کے لئے علم کی تحصیل اور اس کی بقاء کا اہتمام عبادتوں سے زیادہ ضروری ہے۔ جس سے خدا و رسول کی خوشنودی حاصل ہو۔ اب غور کیجئے کہ جب یہ ضرورت و فضیلت ہر زمانہ میں رہی ہے تو اس زمانہ میں کس قدر ہوگی۔ حکومت ہو یا سیاست معاشرت ہو یا معیشت اقتصادیت ہو یا شہریت انسان کے شخصی نجی معاملات ہوں یا اجتماعی امور، غرض ہر میدان میں وہ انسان کی رہنمائی کرتا لیکن افسوس کہ آج کے اس پر آشوب زمانہ میں اس کو اجتماعیت سے نکال کر شخصیت کی حد تک محدود کر دیا ہے۔ جیسا کہ مفکر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسی شخصی حقوق کا دوسرا نام پرسنل لا رکھا گیا ہے جس میں محض انسان کے شخصی حقوق نکاح، طلاق، میراث اور عبادات کی حد تک مسلمانوں کو اپنے دین کے مطابق کرنے میں اختیار دیا گیا تھا۔ لیکن افسوس کہ آج اس شخصی حقوق کو بھی اپنے بنائے ہوئے ناپائیدار نظام سے وابستہ کرتے ہوئے اس ازلی و ابدی دین سے بے رخی ہوتی جا رہی ہے۔ اسلامی علوم و فنون مٹائے جا رہے ہیں اسلامی تہذیب اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہی ہے۔ مغربی تہذیب ہر چیز پر غالب آرہی ہے ••

ارض و سما میں ہیں نہاں کیا کیا نقوشِ زرنگار
تیرا کمال دیکھ کر ہوتی ہے عقل خود شکار

عالمِ کُن فکاں تری چشمِ کرم سے تابدار
چینِ جبیں سے ہے تری دونوں جہاں میں خلفشار

دردِ جگر تجھی سے ہے، تو ہی دوائے دل بھی ہے
خالقِ شان و تمکنت، مالکِ عزت و وقار

غنچۂ و گل میں تیری بو، سینۂ نے میں لَے تری
تیرا ہی عکس سب میں ہے، خواہ خزاں ہے یا بہار

تو نے نظر جو پھیر لی، سارا چمن اُجڑ گیا
تیری ہی اک نگاہ سے دشت و جبل ہیں لالہ زار

کشتیٔ زندگی ہے یوں نرغۂ حادثات میں
جیسے حباب کا مکاں جس کا نہیں کچھ اعتبار

جاہ و جلال کچھ نہیں، مال و منال کچھ نہیں
فرحتِ زار کو ہے بس چشمِ کرم کا انتظار

فرحت قادری

نعت شریف

شۂ لولاک رازِ کن فکاں تخلیق کا منشا
شعورِ حضرتِ آدمؑ وقارِ عَلَّمَ الاَسمَا

وہ جس کے قرب کی منزل پسِ پردہ پسِ پردہ
دَنیٰ، فَتَدَلّیٰ، اس پہ قابَ قوسین اس پہ اَوْ اَدنیٰ

بہ شانِ رحمتِ عالم رسالت تو ہوئی ظاہر
مگر اب تک بھی اُن کی عبدیت ہے رازِ مَا اَوْحیٰ

کہاں پہونچی فرشتوں کی نظر بھی اُنکے چہرے تک
کہ فرشِ کہکشاں پر مہر و مہ تھے اُن کے نقشِ پا

سراپا معنیٔ قرآں ہے روئے احمدِ مرسل
ہے چہرہ وَالضُّحیٰ ہے زلف وَاللَّیلِ اِذَا یَغشیٰ

حجابِ حسن سے ان کے ہوئی یہ عالم آرائی
ادائے بے حجابی ہی سے ہوگا حشر بھی برپا

معزؔ سرکار نے کیا دیکھا ہوگا سدرہ پر جاکر
کہ خود منجملہ آیاتِ حق ہیں، آیتُ الکُبریٰ

(معزالدین معزؔ ملتانی)

حزب اللہ

از:
محمد سراج اللہ خان کامل الفقہ

بمصداق اس مقولہ کے تعرف الاشیاء باضدادھا دنیا میں ہمیشہ دو مختلف گروہ رہے اور اسی اختلاف نے انہیں ایک دوسرے سے ممیز رکھا جس قرآن حکیم نے بایں الفاظ صراحت کی ہے۔ استحوذ علیھم الشیطان فانسٰھم ذکر اللہ اولئک حزب الشیطٰن الا ان حزب الشیطٰن ھم الخٰسرون ۝ شیطان ان پر غلبہ پا لیا پس وہ اللہ کی یاد کو بھلا دیا۔ وہ شیطانی جماعت ہے۔ بے شک شیطانی جماعت گھاٹے میں ہے۔ یعنی شیطانی قوتیں جب غلبہ پاتی ہیں تو اس کے نتیجہ میں خدا کو بھول جانے اور اس سے بے خوف ہو کر نفس پرستی، زر پرستی، جاہ پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسی گروہ کو شیطانی جماعت کہا گیا جو ہمیشہ گھاٹے میں رہی ہے اس کے بالمقابل دوسری جماعت کو اسی کے تحت بایں الفاظ سراہا گیا کہ لا تجد قوماً یؤمنون باللہ والیوم الاٰخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اٰباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ ویدخلھم جنٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ اولئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ۝ تم اس قوم کو جو اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت و خلوص رکھنے والا نہ پاؤ گے اگرچہ وہ ان کے ماں باپ یا بھائی یا ان کے کنبہ والے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے قلوب پر ایمان کا سکہ جما ہوا ہے اور ہم نے ان کی روح القدس سے مدد کی ہے وہ جنات میں جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی داخل کئے جائیں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اس حال میں کہ اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی رہیں گے؛ وہ اللہ کی جماعت ہے۔ یہی اللہ کی جماعت ہمیشہ فلاح پائے گی دوسرے ایک مقام پر ومن یتول اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغٰلبون جو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کی رفاقت اختیار کرے بے شک وہ اللہ کی جماعت ہے۔ جو ہمیشہ غالب رہے گی۔ یعنی جس کے دل میں خدا کا خوف اور خدا اور اس کے رسول کی محبت ہوتی اور یوم آخرت کا خیال رہتا ہے۔ وہ الحب للہ والبغض للہ پر عامل ہوتا ہے وہ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین کی جیتی جاگتی تصویر ہوتے ہیں

"انہیں کی مرضی پہ چل رہا ہوں انہیں کی مرضی تو چل رہی ہے"
"زندگی تو فقط انہیں کی خوشی کے سانچوں میں ڈھل رہی ہے"

ایک اور شاعر نے اپنے خاص انداز میں کیا اچھا کہا ہے ؎

"آزاد ملا ہے مجھے آزاد کی خاطر
ہر ایک سے خفا ہوں تو اُس یار کی خاطر"

ان کو کسی کی خوشی کی فکر ہے نہ بگڑنے کی پروا خیال ہے تو بس یہ کہ

خوش ہم سے رہے جاناں ہم عید اسے کہتے ہیں
بس ایک کے ہو جانا توحید اسے کہتے ہیں۔

ما جعل الله لرجل من قلبین فی جوفہ ع
یک دل داری بس است یک دوست ترا۔ ہر وقت پیش نظر ہوتا ہے اسی مبارک جماعت کو حزب اللہ سے یاد کیا گیا اور نتیجہ میں ان کو ہی غالب قرار دیا گیا ہے۔

تاریخ عالم کی ورق گردانی سے یہ امر بخوبی واضح ہوگا کہ ابتداء آفرینش سے ان دونوں مختلف الخیال گروہوں کی رسہ کشی برابر جاری رہی اور حزب الشیطن نے ہر وقت ہر زمانہ میں حزب اللہ کا تعاقب کیا ان کا دامن پکڑ کر کھینچا اسی حزب الشیطان کی سرکوبی کے لئے ہر وقت ہر قوم میں قدرت نے ہادی بھیجے۔ ولکل قوم ھاد ان ہادیان برحق نے (جن کو ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تصرفات کی اجازت بھی عطا کی گئی۔ جس کو معجزات کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) ہدایت کی گم کردہ راہوں کو راہ ہدایت دکھائی اور تعمیل حکم الٰہی میں تمام آلام و مصائب کو برداشت کرتے ہوئے صراط مستقیم پر چلنے کے طور طریق بتائے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پاک سیرت اسی کی شاہد ہے

سب کے آخر پر حضرت فخر موجودات سرور کائنات ارواحنا فداہ رونق افروز ہوئے۔ جن کی خاطر کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔ لولاک لما خلقت الافلاک جن کو قدرت نے کائنات کے لئے مامور و منتخب فرمایا وما ارسلنک الا کافۃ للناس جن کو علم اولین و آخرین عطا فرمایا گیا علمت علم الاولین و الآخرین جن کے اشارہ پر چاند دو ٹکڑے ہوا جس کی جانب قرآن مجید میں اقتربت الساعۃ وانشق القمر کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس مقام پر اس کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ معجزہ شق القمر سے متعلق ہر بات کو عقل کے سانچے میں ڈھال کر غور کرنے والے قلوب میں شکوک پیدا تھے لیکن حالیہ سائنس کی ترقیات سے جب

خلائی سفر بھی ممکن ہوا اور ہوا بازوں نے چاند تک پہنچنے میں کارروائی حاصل کی تو دیکھا کہ چاند میں دو ٹکڑے ہوکر پھر جڑنے کا تا حال نشان ایک حصہ کی صورت میں موجود ہے جو سرکار مدینہ کے حکم کی تعمیل میں چودہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسی مقام پر ایک شعر یاد آگیا ہے

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہوکر لیا ہے دین کو آغوش میں

اس ذات قدسی صفات کے حکم پر ڈوبا ہوا آفتاب پھر پلٹ رہا ہے۔ زمین ان کا اشارہ پاکر گھوڑے کو کھینچ رہی ہے۔ اور پھر اشارہ پر چھوڑ رہی ہے۔ حیوان ان کے حکم کی تعمیل میں اپنے آپ کو پابند کئے ہوئے ہیں شجر ان کے اشارہ پر اپنی پیڑوں سے چلتے ہوئے آرہے ہیں اور پھر واپس جارہے ہیں امام بوصیری نے بردہ شریف میں کیا خوب فرمایا۔

جاءت لدعوتہ الاشجار ساجدۃ ۔ تمشی الیہ علی ساق بلا قدم

کنکریاں ان کے دست مبارک میں بول رہی ہیں۔ ہجرت کی رات غار حرا کے دہانہ پر مکڑی نے جالا تان کر جنگلی کبوتروں نے انڈے دے کر اپنا پہرہ قائم کر دیا۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

دنیا تمام جن کی صداقت و امانت کی قائل اور صادق و امین کے لقب سے یاد کرتی ہے لیکن جب اللہ کے کلمۃ الحق کے لئے ہادی اعظم نے صدائے حق بلند فرمائی اور یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک یا وانذر عشیرتک الاقربین کے حکم کی تعمیل میں قدم اٹھایا تو سوائے چند افراد کے بقیہ تمام نے دشمن بن کر نہ صرف آپ کی ساحر مجنون کہکر دل آزاری کی بلکہ آپ اور آپ کے متعلقین کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ان توحید کے متوالوں کو چلچلاتی دھوپ میں گرم ریت پر

لٹا کر پیٹھ پر بڑے بڑے پتھر رکھے اطراف سے آگ روشن کی رات رات بھر ان کی پشت پر کوڑے برسائے گئے۔ تاکہ خدا کو ایک ماننے والا خدائے نام کو بلند و بالا کرنے والا اپنے عقیدہ سے پلٹ جائے لیکن ان متوالے توحید کے جز زبان کہاں سے یوں گویا تھے کہ سودا وہ ہوا ہے کہ جو سر جائے تو جائے قدم لغزش نہ آسکی۔ یہ عزم و ہمت کے پہاڑ نظر آرہے تھے کہ ہر تکلیف کو نہایت صبر و استقلال سے برداشت کرتے ہوئے احد احد کہ میرا خدا ایک ہے کی صدا بلند کئے جارہے تھے ان میں بعض کے جسم کو نیزوں سے چھلنی کیا گیا بعض کو اور دوسری تکالیف میں مبتلا کیا گیا مگر کیا مجال تھی کہ ان کے پائے استقلال میں لغزش بھی ہوتی ؎

جان جائے مال جائے آبرو جائے تو جائے
کیا قدم رکھا تھا اس کوچہ میں ٹلنے کے لئے

بعضوں نے ان مصائب سے تنگ آکر بارگاہ رحمۃ للعٰلمین اور واحنا فداہ میں شکایت پیش کی تو ان کو جلد بازی سے کام نہ لینے کی تاکید ہوئی۔ فاصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل۔ یعنی ہمت و استقلال کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ پائے ثبات کو لغزش نہ آنے دو، طاغوتی قوتیں مقابل میں آتی ہیں تو آنے دو۔ پوری توانائیوں سے ان کا مقابلہ کرو۔ جب تک خدائے واحد و قہار کا تصور پوری طرح قائم نہ ہو جب تک اس کے خوف و خشیت سے قلوب مغمور نہ ہوں اس وقت دنیا میں امن کا قیام ممکن نہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کل تیئیس ۲۳ سال کی قلیل مدت میں دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ دوسرے حضرات سے صدیوں میں جس پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں کامیابی حاصل نہ کی تھی وہ اس قلیل عرصہ میں پورا ہوا۔ خطۂ عرب بقعۂ نور بن گیا اس نور سے آفتاب نور کے ہونے اقطاع عالم میں پھیل کر دنیا کو منور کر دیا مگر حزب الشیطان نے بھی ساتھ ساتھ ہر وقت دامن کھینچنے اور ان کو اپنے پروگرام سے باز رکھنے کی ممکنہ کوشش کی۔ جس کے متعلق ہادیٔ اعظم اروا حنا فداہ نے پہلے ہی بایں الفاظ ہوشیار فرما دیا تھا عن ابن مسعود قال صلعم ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہٖ قبلی الا کان لہٗ من امتہٖ حواریون و اصحاب یاخذون بسنتہٖ و یقتدون بامرہٖ ثم انھا تخلف من بعدھم خلوف یقولون ما لا یفعلون و یفعلون ما لا یؤمرون فمن جاھدھم بیدہٖ فھو مومن و من جاھدھم بلسانہٖ فھو مومن و من جاھدھم بقلبہٖ فھو مومن ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل (رواہ مسلم) اور ایک دوسری روایت میں جو حضرت ابوسعید خدری سے امام مسلم میں مروی ہے اس حکم کے ساتھ ہے کہ من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ فان لم یستطع فبقلبہٖ و ذالک اضعف الایمان۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ہر نبی کے بعد یہ ہوتا آیا ہے کہ ان کے امتی ان کے اصحاب ان کے احکام اور ان کے طریقہ کو جاری کرتے ہیں۔ بعد میں اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ جو بات کہتے ہیں کرتے نہیں اور وہ کرتے ہیں جس پر مامور نہیں پس ایسی صورت میں جو ان کے خلاف عمل سے جہاد کرے وہ مومن ہے۔ جو زبان سے خلاف کرے وہ مومن ہے ورنہ کم از کم جو دل سے اس کو برا سمجھے وہ بھی مومن ہے۔ ان کے بعد تو رائی برابر ایمان کا وجود نہیں پس چاہئے کہ جب تم کسی کو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کرتے دیکھو تو عمل سے مقابلہ کرو اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے خلاف کہو۔ اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل سے برا جانو یعنی ان کا ساتھ نہ دو اور یہ صورت آخر کمزور ایمان کی نشانی ہے۔ یعنی کبھی اپنوں میں بھی حزب الشیطان کی ریشہ

دوائیاں پھیل جاتی ہیں۔ جس کا انسداد قوت سے ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ یہ ایک مستقل فتنہ بن جاتی ہیں۔ چنانچہ عاشقان جاں باز بین کی نظر ہمیشہ خدا پر رہی اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو بلند وبالا کرنا ہی مقصد حیات سمجھتے تھے۔ ہر زمانہ اور ہر دور میں اپنے امکانی فرائض انجام دیتے رہے جہاں دوسروں نے لیس ھذا زمان حدیث انما ھذا زمان بکاء وتضرع ودعا کدعا الغرق کہ یہ زمانہ درس واشاعت علوم و سنت کا نہیں یہ تو وہ زمانہ ہے کہ بس اللہ کے آگے تضرع وزاری کرو اور ایسی دعائیں مانگو جیسی کہ سمندر میں ڈوبتا ہوا شخص مانگتا ہے کسی نے کہا کہ احفظوا السنتکم وعالجو قلبکم وخذوا ما تعرفوا ودعوا ما تنکروا۔ اپنی زبان کی نگہبانی کرو اپنے قلوب کا علاج کرو جو جانتے ہو کرو اور جو برا سمجھتے ہو چھوڑ دو کسی نے ھذا زمان السکوت وملازمة البیوت کا فیصلہ دیا کہ یہ سکوت اور خانہ نشینی کا زمانہ ہے۔ وہاں مجاہدین فی سبیل اللہ بڑے اور طاغوتی قوتوں کا جم کر مقابلہ کیا جیسا کہ حضرت امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کی سیرت سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کو مخلوق ٹھہرانے میں خلیفہ معتصم باللہ جس کی ہیبت وسطوت سے قیصر روم لرزاں وترساں ہے سامنے ہے۔ چاروں طرف جلاد کا مجمع ہے۔ اور آپ سے خواہش کی جاتی ہے کہ قرآن کو مخلوق تسلیم کرو آپ کے انکار پر جور وستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں روزہ کی حالت میں آپ کی پشت پر تازیانے کے ضرب لگائے جاتے ہیں۔ پوری پشت زخموں سے چور ہو جاتی ہے۔ آپ بیہوش ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں جب ہوش میں آتے ہیں پانی دیا جاتا ہے کہ پی لو تو فرمایا کہ میں روزہ سے ہوں روزہ توڑ نہیں سکتا۔ وزنی بیڑیاں پیروں میں پہنا کر اسی حالت میں اونٹ پر سوار ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ یہ تمام مصائب سہتے ہیں مگر خلق قرآن کو تسلیم نہیں فرماتے مختلف طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو فرماتے ہیں کہ ما ادری ما ھذا میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے۔ اعطونی شیئاً من کتاب اللہ وسنة رسولہ حتی اقول مجھے کتاب اللہ وسنت رسول مقبول سے کچھ بتاؤ تاکہ میں کہہ سکوں۔ اسی طرح آخر تک ڈٹ کر مقابلہ کیا ہر قسم کی سختی برداشت کی مگر حزب الشیطین کے آگے سر نہ جھکایا

سنہ ۶۱ھ میں جبکہ بدعات ومحدثات بنو امیہ نے سر اٹھایا فسق وفجور کا بازار گرم ہونے لگا۔ حکومت کے خلاف لب کشائی کرنے سے ہر شخص خائف تھا۔ بڑی بڑی ہستیاں اپنے اپنے مقام پر سہمی ہوئی خاموش تماشائی کی حیثیت سے اپنے اپنے مکانات میں خلوت گزیں ہو گئی تھیں۔ ایسے پر آشوب وپرفتن دور میں خاندان نبوت کے چشم وچراغ امام الاصفیا سید الشہدا سیدنا امام حسین علیہ وعلی ابیہ الف تحیات والتسلیم نے باوجود دنیا کی مخالفت کے اپنے خانوادہ کو ساتھ لے کر طاغوتی قوتوں کا وہ ہمت واستقلال سے مقابلہ کیا کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی اس طرح دنیا کو ولا تطع منھم آثما او کفورا اور واستقم کما امرت ومن تاب معک ولا تطغوا انہ بما تعملون بصیر اور ولا ترکنوا الی الذین ظلموا کے حکم کی تعمیل کا عملی نمونہ پیش فرمایا جس کے لئے آپ مامور تھے جس کی خبر مخبر صادق علیہ الصلوۃ والتسلیم نے پہلے ہی دی تھی۔ حضور غریب نواز علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

بہر حال ہر دور میں حزب الشیطٰن کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں اور اس کی آرزو اور تمنا بھی رہی کہ حزب اللہ کا نام و نشان باقی نہ رہے مگر تائید ایزدی شامل حال رہی اور زمانہ جب کبھی ضرورت پڑی قدرت نے خود اس کی حفاظت کا انتظام فرمایا یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۔

فانوس بن کے جسکی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

آج کے دور میں جبکہ حزب الشیطٰن کی سرگرمیاں تیز تر ہوگئی ہیں تعلیم کے نام تحریب آزادی کے نام سے بے راہ روی نے جنم لیا ہے۔ امن چین برخاست فسق و فجور کا بازار گرم شرم و حیا رخصت، حق و صداقت مفقود، دیانت ختم، کذب و افترا عام سمجھا جا رہا ہے۔ اور خود غرضی و زر پرستی عام ہوگئی ہے جیسا کہ حضور انور علیہ التحیۃ والتسلیم نے بہتر و بدتر کی یوں تشریح فرمائی تھی اذا کانت امراءکم خیارکم و اغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوری بینکم فظھر الارض خیر لکم من بطنھا و اذا کانت امراءکم اشرارکم و اغنیاءکم بخلاءکم و امورکم الی نساءکم فبطن الارض خیر لکم من ظھرھا (رواہ الترمذی)

جب تک تم میں بہتر اور نیک لوگ امیر ہوں گے اور تمہارے مالدار سخی اور تمہارے معاملات باہم مشورہ سے انجام پائیں گے تو زمین کا ظاہر اس کے باطن سے بہتر ہوگا۔ یعنی دنیا میں رہنا موجب عزت و کامیابی ہوگا اور جب ایسا ہو کہ تمہارے امیر بدترین لوگ ہوں تمہارے مالدار بخیل ہو جائیں اور تمہاری حکومت عورتوں کے ہاتھوں میں چلی جائے تو پھر زمین کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر ہوگا۔ یعنی جب عزت ہی باقی نہ رہے تو ایسی زندگی سے موت بہتر ہے فتفکروا یا اولی الالباب ۔

ہر طرح کی عزت حکم خدا و رسول کی تعمیل میں مضمر ہے۔ ضرورت اور شدید ضرورت اس کی ہے کہ پھر سے حزب الشیطٰن کے مقابلہ کے لئے اسلاف کی زندگی کو سامنے رکھ کر عملی میدان میں قدم رکھیں ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اللھم اھدنا الصراط المستقیم و الحمد للہ رب العالمین ۰

بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
★
آغوش صدف جسکے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
★ اقبال

از محمد عابد حسین کامل جامعہ نظامیہ

اسلامی نظریہ سیاست کی نوعیت

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا ملوکیت کے زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی زمین کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو اس لعنت میں مبتلا نہ ہو اور اس ساری کائنات میں کوئی ایک انسان جمہوریت کے نام سے آشنا نہ تھا، مگر ظہور اسلام کے ساتھ ہی اس کی سب سے پہلی ضرب ملوکیت کے باطل نظام پر پڑی کلمہ توحید کی ایک ہی گونج نے مشرق و مغرب میں شہنشاہیت کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا اور چند دنوں میں خالص اسلامی نظریہ سیاست کی بنیاد وں پر ایک معیاری حکومت قائم کرکے دکھادی ! اس اسلامی نظریہ حکومت کی نوعیت کیا ہے ؟ اسکے لئے ہمیں دیگر سیاسی نظریات کی طرف جانیکی ہرگز ضرورت نہیں، موجودہ دنیا میں ہمارے سامنے کوئی ایسا سیاسی نظام نہیں، جو اسلام کے نظریہ سیاست کے لئے بطور مثال پیش کیا جاسکے ! ورنہ کسی خاص نظریہ کو اسلام کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اشتراکیت جمہوریت آمرانہ طرزِ حکومت یا کسی دوسرے انسانی نظریہ سیاست کو اسلام سے کوئی ادنیٰ مناسبت بھی نہیں ۔ اسلام اپنی مثال آپ ہے اور خود ہی اپنی مخصوص نظریہ سیاست و اجتماع کا شارح ہے، اسلام کی نسبت بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے الاسلام ھوالاسلام ۔ یعنی اسلام چونکہ اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے بالکل جداگانہ اور مستقل بالذات وجود رکھتا ہے اسلئے ہم اسلام کو صرف اسلام کی اصطلاح سے پہچان سکتے ہیں ۔ مگر صرف اس بنا پر کہ اس کا طرز حکومت طرز مشورہ پر مبنی ہے اسلئے اسکے نظریہ سیاست کو جمہوریت سے تعبیر کرسکتے ہیں ؟ مگر اسلام کی جمہوریت، موجودہ دور کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے جمہوریت کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قانون ساز خود جماعت ہوتی ہے لیکن اسلام کا قانون، قانون الہی ہے اسمیں کسی بندے کو تغیر و تبدل کرنے کا اختیار نہیں ۔ خلیفہ وقت صرف اس کا نافذ کرنے والا ہوتا ہے پھر اسلام کا طرزِ مشورہ اور طرزِ انتخاب بھی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے ؟ لھذا جمہوریت کے اطلاق سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلام بھی موجودہ نظام جمہوریت کی طرح کا کوئی نظام ہے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس شخصیت تھی آپ کے قول و فعل میں خطا کا احتمال نہ تھا کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت کرنے والے تھے مگر اسکے باوجود آپ کو واضح الفاظ میں حکم دیا گیا کہ آپ حکومت کے کاروبار اور دیگر معاملات میں مومنین سے مشورہ کر لیا کریں ۔ چنانچہ ارشاد باری ہے کہ وشاورھم فی الامر ۔ نیز اہل ایمان کے اوصاف میں ایک بڑا وصف ارشاد فرمایا کہ وہ امور خلافت اور دوسرے معاملات کو باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں ؟ وامرھم شوریٰ بینھم ۔ امر کا لفظ کتاب و سنت میں حکومت و خلافت کے لئے اکثر استعمال ہوا ہے چنانچہ واولی الامر منکم ۔ میں باتفاقِ مفسرین اولاً و بالذات حکام سیاست مراد ہیں ۔؟

انا لانولی ھذا الامر من سالہ' ۔ ہم اس شخص کو حاکم نہیں بنا سکتے جو اس کا خواہش مند ہو اس امر سے مراد منصب حکومت ہے ؟ بے شمار آیات و احادیث میں امر کا لفظ ان معنوں میں وارد ہوا ہے ۔ لھذا آیات مذکورہ

وزنا ورھم فی الامر د میں یہی مراد لیئے جائیں گے ان آیات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت و خلافت کی بنیاد طریق شورٰی پر ہے، اور اس میں نظام ملوکیت کی طرح استبداد شخصی وراثت وولیعہدی کا کوئی شائبہ موجود نہیں۔ (قواعد) انتخاب عام اور طرز مشورہ کا منشا اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ امارت وخلافت اور نمائندگی کے لیئے کوئی شخص خود اپنے آپکو پیش نہ کرے بلکہ جمہور اصحاب علم وعمل اور فکر و دانش خود کسی مسلمان کو اسکے اوصاف کے لحاظ سے منتخب کریں۔ اس طرح انکو اظہار خیال کی پوری آزادی مل سکتی ہے، اسکے برعکس جب ایک یا چند اشخاص خود ہی امارت ونمائندگی کے لیئے بطور امیدوار کھڑے ہوں تو رائے عامہ بیرونی اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ ہر ایک امیدوار ووٹ حاصل کرنے کے لیئے ترغیب وتربیت کے امکانی وسائل استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریگا جس سے آزادی رائے پر برا اثر پڑتا ہے، اسلامی جمہوریت کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے جو موجودہ جمہوریت میں کلی طور پر فنا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ خلیفہ بنے نہیں بلکہ بنائے گئے اور انہوں نے بادل ناخواستہ ملت کو انتشار و بدانتظامی سے بچانے کی خاطر یہ منصب قبول کیا۔

حضرت عمر فاروق رضؓ نے وفات سے قبل جو خطبہ ارشاد فرمایا اسمیں بھی اسی طرز مشورہ کا اظہار کیا گیا۔ فان عجل بی امر فالخلافۃ شوری بین ھٰولآء النفر الذین توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو عنھم راض، اگر مجھے موت آجائے تو خلافت کے لیئے ان اشخاص میں کسی ایک کو انتخاب کرلیا جائے جن سے آنحضرتؐ اس حال میں رخصت ہوئے کہ آپ ان سے راضی تھے۔ اسکے بعد آپ نے چھ اصحاب کے نام لیئے۔ الفاظ سے ظاہر ہے کہ آپ نے چھ حضرات کے لیئے سفارش کی کیونکہ یہ سبقت فی الاسلام اور خدمات کے اعتبار سے مستحق خلافت تھے مگر آپ نے کسی کو نامزد نہیں کیا بلکہ اسکا فیصلہ رائے عامہ کے سپرد کیا اور یہ بھی فرمایا کہ لاخلافۃ الا من مشورۃ۔ خلافت کا معاملہ جمہوریت کے مشورے کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے بعد حضرت عمر رضؓ بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین بنایا تھا، مگر حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے مجمع عام میں اعلان کیا کہ میں غیر اسلامی طرز پر مسلمانوں کا حاکم بنایا گیا ہوں اس لیئے خلافت سے دست بردار ہوتا ہوں مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ جسکو چاہیں امیر منتخب کرلیں دنیا میں شاید کوئی ایسی مثال نہ مل سکے گی کہ ایک عظیم الشان سلطنت کو صرف اس لیئے ٹھکرادیا گیا کہ یہ جائز طریقہ سے حاصل نہیں ہوئی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ ہی وہ بلند پایہ انسان ہیں جنہوں نے شاہانہ وقار اور مسند حکومت کو اصول اسلامی کے لیئے قربان کردیا۔ بہرحال خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے اپنے طرز عمل سے یہ دکھادیا کہ اسلام کا نظام سیاست وراثت وجانشینی کے ملوکانہ تصور سے بالکل الگ ہے، اسلام اس جاہلی تصور کو کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔

موجودہ طرزِ جمہوریت کی حد کمال

موجودہ عالم کے نظام جمہوریت میں اس قدر نقائص ہیں کہ اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو اسمیں اور آمریت وملوکیت میں نمایاں فرق باقی نہیں رہتا۔ زیادہ سے زیادہ نیبل کا فرق آسکتا ہے یعنی ایک حقیقت کے دو عنوان ہیں (۱) نظام سیاست کی بنیاد ہی اس غیر فطری تصور پر قائم ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسانوں پر یا سب سے بڑی جماعت کو کمزور اور چھوٹی جماعتوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے، اور یہی وہ بنیادی نقص ہے جو انسانی سوسائٹی کے تمام مفاسد کا سرچشمہ ہے انسانی فطرت اس سے کرتی ہے کہ وہ اپنی ہی جنس کی غلامی اختیار کرے خواہ یہ حکومت اور استبدادِ شخصی کی صورت میں ہو یا جمہوریت کے لباس میں (۲) ایک صالح اور مہذب نظام حکومت حکومت وہی ہوسکتا ہے جس کی بنیاد اخلاق اور مابعد ربط تصورات پر قائم ہو کیونکہ یہی چیز حیاتِ انسانی کے لئے اصل روح کی

حیثیت رکھتی ہے اور اسی سے زندگی کے منتشر اجزاء میں ربط و نظم پیدا ہوسکتا ہے اور عالمگیر بے چینی و اضطراب کو دور کیا جاسکتا ہے اسکے علاوہ اور کسی نظام کے ذریعہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

اسلام کا نظام سیاست و اجتماع

نوائے گرد تو ہم شوکتِ دریاچہ می داند
اسیر عذر تنگی وسعتِ صحرا چہ می دانی

جن لوگوں کی آنکھیں اس شعاع منعکس اور ضو مستعار سے خیرہ تاریک ہیں کاش انکی نگاہ غلط بیں اسلامی کے مرکز انوار کی طرف بھی اُٹھ سکتی جن کی زبان پانی کے چند قطروں کے لئے ترس رہی ہے، کاش وہ اس آب حیوان تک پہنچ سکتے جس میں پوری دنیا کو سیراب کرنیکی صلاحیت موجود ہے اور کاش انکو معلوم ہوسکتا کہ وہ جس کو مسیحا سمجھکر اسکے گرد طواف کررہے ہیں وہ تو خود نیم جان بیمار اور دوسرے کے دست شفا کا محتاج ہے، سنگریزوں کو جواہر تصور کرلینے سے حقیقۃً سنگریزے جواہر نہیں بن سکتے خاکستر کو آگ سمجھکر پھونک مارنے والے خوب سمجھ لیں کہ ان کے ہوا دینے سے اسمیں اشتعال پیدا نہیں ہوسکتا۔

دنار لو نفخت بھا اضاءت
ولکن انت تنفخ فی الرماد

اسلام کا نظریہ اجتماع و سیاست ضابطہ اخلاق و تمدن اور آئین اقتصاد و معیشت ہی انسانی زندگی کے مشکل مراحل طے کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی وہ نظریۂ حیات ہے جسمیں بڑھنے پھیلنے اور صالح تمدنی ارتقاء کا ساتھ دینے کی نہ صرف صلاحیت ہے بلکہ وہ خود ایک صالح تمدن کا بانی ہے جو سارے عالم کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ایک نہ ایک دن زمانہ آنیوالا ہے جبکہ دنیا کا ہر انسان اسلام کے عالمگیر فلسفۂ زندگی میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ۔ خدائے بزرگ برتر نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو سارے ادیان پر غالب کردے۔

اسلام کا نظریہ حاکمیت

حکومت کا کاروبار چلانے اور انسانی سوسائٹی نظم قائم رکھنے کے لئے اس زمین میں خدا کی طرف سے ایک نیابتی جماعت کام کرتی ہے جو ایک مزدور کی حیثیت سے اپنے آقا کے معین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے فرائض انجام دیتی ہے اور حقیقت میں یہی جماعت ہے جو نیابتِ الٰہی کے فرائض انجام دیتی ہے اور قیادت عظمیٰ کی مستحق ہے اس کی راہ متعین ہے اور اس کا آئین اٹل ہے۔ اقوام عالم کے نظروں میں ہر لمحہ تبدیلی کا امکان ہے، مگر اس جماعت کا ہر نظریہ غیر تبدل وہر تصور غیر متغیر اور ہر قانون دائمی اور پائیدار حیثیت رکھتا ہے۔ رات کی تاریکی میں بھٹکنے والی قومیں راستے کے ہر سنگ میل کو آخری منزل مقصود تصور کرلیتی ہیں۔ ظلمت بعضھا فوق بعض۔ مگر اس جماعت کا ایک قدم بھی اندھیرے میں نہیں اُٹھ سکتا کہ اسکے چاروں طرف انوار الٰہی کی بارش ہورہی ہے۔

نورٌ علیٰ نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء۔ محض حسن ظن کی بنا پر نہیں بلکہ واقعات فکر و نظر اور علم و سیرت کی بنا پر یہ ماننا پڑھتا ہے کہ اسلام کا پیش کردہ نظریہ حیات ہی انسانی دنیا کی تمام مشکلات کو احسن طریقہ پر حل کرسکتا ہے اور اس کے ذریعہ دنیا میں قیادت عظمیٰ کی داغ بیل ڈالی جاسکتی ہے مسلمان اس فلسفہ زندگی کا علمبردار اور اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ بنی نوع انسان کی رہنمائی کرے۔

حضرت مولانا مفتی عظیم الدین صاحب
مفتی جامعہ نظامیہ

باب الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ حج بدل کا جواز کس صورت میں ہوگا۔ حج بدل کے سلسلہ میں اگر کسی غیر حاجی وغیرہ مستطیع عالم دین سے جو احکام و مناسک حج سے واقف ہو حج بدل کروایا جائے تو جائز ہے یا نہیں بینوا توجروا۔

الافتاء

ایسا شخص جس پر حج فرض ہے لیکن کسی مرض وغیرہ کی وجہ وہ زندگی میں سفر حج کے قابل نہیں رہا ہے اپنی طرف سے یا کسی مرحوم کے ورثاء اپنے مورث کی طرف سے حج بدل کروانا چاہیں تو حج بدل جائز ہے (تقبل النیابۃ عند العجز فقط) لکن (بشرط دوام العجز الی الموت) لانہ فرض العمر حتی تلزم الاعادۃ بزوال العذر... (فلا یجوز حج الغیر لغیر اذنہ الا اذا حج) ای (الوارث عن مورثہ) درالمختار جلد ۲ کتاب الحج باب الحج عن الغیر۔

ف ۲: حج بدل کے لئے ایسے عالم دین کو بھیجنا جو اپنی طرف سے حج، مال کی عدم موجودگی کی وجہ ادا نہ کیا ہو جائز ہے۔ (لکنہ بشرط) لصحۃ النیابۃ اھلیہ ۔ المامور لصحۃ (الافعال) ثم فرع علیہ بقولہ (فجاز حج الضرورۃ) بجملۃ من لم یحج درالمختار کتاب الحج باب الحج عن الغیر فقط واللہ اعلم

الاستفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید کہتا ہے کہ ملاقات کا مصافحہ بلاشبہ سنت ہے لیکن خاص کر بعد نماز جمعہ و بعد نماز فجر و بعد نماز تراویح سنت جانکر مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ بکر کہتا ہے کہ جمعہ و فجر و تراویح کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا سنت ہے ازروئے شرع کس کا قول درست ہے۔

ف ۲: قصبہ جنبلی ضلع بیدر شریف میں ہر فرض نماز کے ختم پر بشمول جمعہ اور عیدین میں بعد نماز عید امام صاحب اجتماعی دعا مانگتے ہیں، لیکن بعض مصلیوں کا اصرار ہے کہ جمعہ میں بعد ادائی سنن و نوافل اور عیدین میں بعد ختم خطبتین بھی دعا ثانی امام صاحب اجتماعی طور پر مانگیں۔ ایسی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے۔

ف ۳: بعض مساجد میں نماز تراویح میں ہر دو رکعت اور چار رکعت کے بعد اجتماعی طور پر باآواز بلند تسبیح پڑھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم و

خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسماء مبارک لیئے جاتے ہیں لیکن بعض مساجد میں دو رکعت کے بعد کچھ نہیں پڑھا جاتا البتہ ہر چار رکعت کے بعد ترویحہ میں آہستہ آہستہ تسبیحات اور دعا پڑھتے ہیں۔ دونوں میں کونسا طریقہ مسنون و افضل ہے نیز بعد ختم تراویح دو تر رمضان میں اجتماعی طور پر مصلیوں کا صحن مسجد میں کھڑے ہوکر مشہور پیغمبروں پر بہ آواز بلند صلوات وسلام بھیجا گیا ہے۔ بینوا توجروا۔

الافتاء

ہر ملاقات کے وقت معانقہ سنت ہے۔ بریں بنا نمازوں کے بعد بھی اگر معانقہ کیا جائے تو وہ بھی سنت میں داخل ہے لیکن صرف نماز جمعہ، نماز فجر اور تراویح کے بعد سنت کہنا صحیح نہیں تجوز المصافحۃ لانھا سنۃ قدیمۃ متواترۃ.... یفید جوازھا مطلقا ولو بعد العصر وقولھم انہ بدعۃ ای مباحۃ حسنۃ کما افادہ النووی فی اذکارہ درالمختار برحاشیہ رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۲۴۴ ـ کتاب الحظر والاباحۃ اور ردالمحتار میں ہے اعلم ان المصافحۃ مستحبۃ عند کل لقاء واما ما اعتادہ الناس من المصافحۃ بعد صلاۃ الصبح والعصر فلا اصل لہ فی الشرع علی ھذا الوجہ ولکن لا باس بہ فان اصل المصافحۃ سنۃ... ثم یقال: ان المواظبۃ علیھا بعد الصلوات خاصۃ قد یودی الجھلۃ الی اعتقاد سنتھا فی خصوص ھذہ المواضع ـ

۶ : جن فرض نمازوں کے بعد سنت نہیں ہے ان میں فرض کے بعد اور جن کے بعد سنن ہیں ان میں سنن و نوافل ادا کرنے کے بعد اجتماعی دعا کرنا مستحب ہے یعنی ایسا عمل مستحسن ہے اور اگر کوئی ایسا نہ کرے تو کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ امداد الفتاح شرح نور الایضاح فصل فی صفۃ الاذکار بعد صلاۃ الفرض میں ہے ویستحب ان یستقبل بعدہ ای بعد التطوع ان کان وکذا اذا لم یکن بعد الفرض یستقبل الناس بوجہہ ان شاء اذا لم یکن فی مقابلۃ مصل لما فی الصحیحین وغیرھما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی اقبل علینا بوجھہ وان شاء الامام انحرف عن یسارہ وجعل القبلۃ عن یمینہ کما لو کان استقبالہ یقع مواجھا لمصل ولو فی صف البعد منہ وھذا اولی لما فی مسلم کنا اذا صلینا خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احببنا ان نکون عن یمینہ حتی یقبل علینا بوجھہ وان شاء ذھب لحوائجہ لانہ قد تعفی ھصلاتہ وقد قال اللہ تعالیٰ فاذا قضیت الصلواۃ فانتشروا فی الارض والامر للاباحۃ وکونہ فی الجمعۃ لاینبغی کونہ غیر صابر ثبت فیہ بطریق الدلالۃ جن فرض نمازوں کے بعد سنتیں ہیں ان میں فرض کے بعد صرف دعاء ماثورہ اللھم انت السلام ومنک السلام الخ پر اکتفا کیا جائے۔ کبیری شرح منیۃ المصلی صفحہ ۳۳۱ میں ہے۔ فان کان بعدھا ای بعد المکتوبۃ تطوع یقوم الی التطوع بلا فصل الا مقدار

اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذالجلال والاکرام ویکرہ تاخیر السنۃ عن حال اداء الفریضۃ باکثر من نحو ذلک القدر عیدین میں خطبتین کے ختم پر دعا کیجائے ۔

ف۳ : تراویح کے ہر دوگانہ کے بعد استراحت کرنا مثلاً تسبیح وتہلیل وغیرہ کرتے ہوئے بیٹھنا مکروہ ہے درالمختار جلد اول صـ۴۷٤ میں ہے ۔ نعم تکرہ صلاۃ رکعتین بعد کل رکعتین اور ردالمختار میں ہے (قولہ نعم تکرہ الخ) لان الاستراحۃ مشروعۃ بین کل ترویحتین لا بین کل شفعین البتہ ہر چار رکعت کے بعد اسی مقدار بیٹھنا مستحب ہے اور نمازیوں کو اختیار ہے کہ ایسی حالت میں سب کے سب تسبیح پڑھیں یا خاموش رہیں یا قرآن کی تلاوت کریں یا تنہا نماز پڑھیں ۔ (یجلس) ندباً (بین کل اربعۃ بقدرھا وکذا بین الخامسۃ والوتر) ویخیرون بین تسبیح وقراءۃ وسکوت وصلوۃ فرادیٰ درمختار مسجد میں باآواز بلند تسبیح وتہلیل سے مطلقاً منع نہیں کیا جاسکتا مگر یہ کہ اتنی بلند آواز بھی نہ ہو کہ کسی کی نماز یا تلاوت یا آرام میں خلل واقع ہو ردالمحتار جلد اول صـ۴۴٤ میں ہے وفی حاشیۃ الحموی عن الامام الشعرانی اجمع العلماء سلفا وخلفا علیٰ استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد وغیرھا الا ان یشوش الجھر علی نائم او مصل او قاری الخ

بزازیہ میں ہے ان الذکر بالجھر فی المسجد لا یمنع احترازا عن الدخول تحت قولہ تعالیٰ ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ صلاۃ پکارنے کا بھی یہی حکم ہے ہر چار رکعت کے بعد تسبیح پڑھ کے جناب رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم وخلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جو اسماء گرامی لیئے جاتے ہیں اسکی کوئی سند نہیں ہے اگر اس خیال سے لیئے جاتے ہیں کہ تراویح سنت نبویؐ اور اسکی جماعت جو سنت خلفاء راشدین ہے اسکی یاد تازہ رہے اور تعداد رکعت معلوم ہو تو اس میں مضائقہ نہیں ہے ۔ مصافحہ کرنا بلاشبہ سنت متواترہ ہے کسی وقت کے ساتھ مقید کرنے سے سنت کی نفی نہیں ہوتی وجہ یہ کہ مطلق سنت کا وجود تو کسی مقید ہی میں ہوگا اسی طرح اجتماعی دعا کا ثبوت احادیث وآثار واجماع امت سے خلفاً عن سلفٍ عملاً جاری ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔

ابو حنیفہ ہم عصروں کی نظر میں

از : محمد عبداللہ متعلم عالم سندی

نعمان بن ثابت نام، ابو حنیفہ کنیت، امام اعظم لقب آپ فارسی الاصل ہیں۔ آپ کے اجداد روسا میں سے اور آپ کے والد بڑے تاجر تھے اور حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے اُن کے خاندان کے لئے دعا فرمائی۔ امام صاحبؒ کی سن ولادت میں اختلاف ہے لیکن ۸۰ھ پر زیادہ وثوق ہے۔ ۹۶ھ میں امام صاحبؒ اپنے والد کے ساتھ حج کو گئے۔ وہاں عبداللہ بن حارث صحابی سے ملے اور حدیث سنی دوبارہ ۱۱۶ھ میں حج کیا اُس زمانہ میں جو صحابہؓ زندہ تھے ان سے ملے۔ امام صاحبؒ نے بقول ابو حفص کبیر چار ہزار شیوخ سے علم حاصل کیا جب آپ نے تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی درسگاہ کی ایسی شہرت ہوئی کہ کوفہ کی اکثر درسگاہیں ٹوٹ کر ان کی درسگاہ میں شامل ہو گئیں۔ ان کی شہرت و شخصیت کا اندازہ مندرجہ اقوال کی روشنی میں بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

قیس ابن ربیع کا قول ہے کہ ابو حنیفہؒ پرہیزگار محمود خلائق تھے۔ جو ان کے پاس التجا لیجاتا اس کے ساتھ بہت سا سلوک کرتے۔ بھائیوں کے ساتھ بکثرت احسان کرتے انہیں کا قول ہے کہ ابو حنیفہؒ مال تجارت بغداد بھیجتے اس کی قیمت کا مال کوفہ منگواتے سالانہ منافع جمع کر کے شیوخ محدثین کے لئے ضرورت کی چیزیں خریدتے۔ خوراک اور لباس غرض جملہ ضروریات کا انتظام کرتے اس سے جو روپیہ بچتا وہ نقد جملہ سامان کے ساتھ یہ کہہ کر ان کے پاس بھیجتے کہ اس کو خرچ کرو اور سوائے اللہ کے کسی کی تعریف نہ کرو۔ (لانی ما اعطیتک من مالی شیئًا) اس لئے کہ میں نے اپنے مال میں سے تمکو کچھ نہیں دیا۔ محمد بن بشرؒ کا قول ہے کہ میں ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ دونوں کے پاس جاتا تھا۔ جب ابو حنیفہؒ کے پاس جاتا پوچھتے کہاں سے آئے۔ سفیانؒ کا نام سن کر کہتے تم ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو کہ اگر آج علقمہ اور اسود زندہ ہوتے تو سفیانؒ کے محتاج ہوتے جب سفیان سوال کے جواب میں سنتے کہ ابو حنیفہؒ کے پاس سے آیا ہوں تو کہتے تو ایسے شخص کے پاس سے آئے ہو جو روئے زمین پر سب سے زیادہ فقیہ ہے۔

عبداللہ بن داؤد الخریبی کا قول ہے کہ اہل اسلام پر واجب ہے کہ نماز کے بعد ابو حنیفہؒ کے حق میں اس حفاظت کے صلہ میں جو انہوں نے سنت اور فقہ کی کی ہے۔ دعائے خیر کریں عبداللہ بن مبارک کا قول ہے کہ میں اوزاعی سے ملنے شام گیا بیروت میں ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھ سے کہا کہ اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی پیدا ہوا ہے یہ سن کر میں مکان پر آیا ابو حنیفہؒ کی کتابیں نکالیں اور ان میں سے چیدہ چیدہ مسائل چھانٹ کر نکالے اس میں تین دن لگ گئے۔ تیسرے روز ان کے پاس پھر گیا وہ مسجد کے موذن اور امام بھی تھے میرے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر کہا یہ کیا ہے؟ میں نے ہاتھ بڑھا کر حوالہ کر دی۔ انہوں نے ایک مسئلہ پر نظر ڈالی جس پر لکھا تھا۔

قال النعمان۔ اذان ہو کر کھڑے کھڑے پہلا حصہ پڑھ لیا۔ پڑھ کر کتاب آستین میں رکھ لی پھر تکبیر کہہ کر نماز پڑھی نماز پڑھ کر کتاب نکالی اور سب پڑھ لی پھر دیکھ کر کہا یہ نعمان بن ثابت کون ہیں میں نے کہا ایک شیخ ہیں جن سے عراق میں ملاقات ہوئی تھی۔ کہا بڑی شان کے شیخ ہیں۔ جاؤ اور ان سے بہت سا فیض حاصل کرو میں نے کہا یہ وہی ابو حنیفہ رح ہیں جن سے مجھ کو آپ نے روکا تھا۔ مسعر بن کدام کا قول ہے کہ کوفے میں صرف دو آدمیوں پر مجھ کو حسد ہے۔ ابو حنیفہ رح پر ان کے فقہ کی وجہ سے اور حسن بن صالح پر ان کے زہد کی وجہ سے۔ امام صاحب رح نے فقہ خاص کر سیکھی۔ حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ درس میں اندر سوا کوئی اور استاد کے سامنے نہ بیٹھا دس برس ان کی صحبت میں رہے۔ ایک موقع پر اپنی جگہ ان کو بٹھا کر حماد باہر گئے یہ لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتے رہے ایسے مسئلے بھی آئے جو استاد سے نہ سنے تھے۔ استاد کی واپسی پر مسائل مذکور خدمت میں پیش کئے۔ جو ساٹھ تھے۔ استاد نے چالیس سے اتفاق کیا بیس سے اختلاف شاگرد نے قسم کھائی کہ ساری عمر حاضر خدمت ہوں گا چنانچہ استاد کی وفات تک ساتھ رہے کل زمانہ رفاقت اٹھارہ برس تھی۔ استاد کے بیٹے اسمٰعیل کہتے ہیں کہ ایک بار والد سفر میں گئے اور کچھ دن باہر رہے۔ واپسی پر میں نے پوچھا ابا جان آپ کو سب سے زیادہ کس کے دیکھنے کا شوق تھا۔ (اسمٰعیل کا خیال تھا کہیں گے تمہارے دیکھنے کا) عبداللہ بن مبارک کا قول ہے کہ میں نے کوفہ پہونچ کر پوچھا کہ کوفہ والوں میں سب سے زیادہ پارسا کون ہے لوگوں نے کہا ابو حنیفہ رح ان کا یہ بھی قول ہے کہ میں نے ابو حنیفہ سے زیادہ کوئی پارسا نہیں دیکھا حالانکہ دروں سے مال و دولت سے ان کی آزمائش کی گئی اور اپنے زمانہ میں امام صاحب رح سب سے زیادہ عابد پارسا ہونے کی تائید میں اور بھی متعدد قول خطیب نے نقل کئے ہیں۔ سفیان ابن عیینہ کا قول ہے کہ ہمارے وقت میں کوئی آدمی مکہ میں ابو حنیفہ رح سے زیادہ نماز پڑھنے والا نہیں آیا ان کا یہ بھی قول ہے کہ وہ نماز اول وقت ادا کرتے تھے۔ ابو مطیع کا قول ہے کہ میں قیام مکہ کے زمانہ میں رات کی جس ساعت میں طواف کو گیا ابو حنیفہ رح اور سفیان ثوری کو طواف میں مصروف پایا۔ یحیی ابن ایوب الزاہد کا قول ہے کہ کان ابو حنیفہ رح لا ینام اللیل وکان قائم اللیل ابو حنیفہ رح شب بیدار تھے۔ اسد بن عمر کا قول ہے کہ ابو حنیفہ رح شب کی نماز میں ایک رکعت میں پورا قرآن مجید ختم کر دیتے تھے۔ ان کا گریہ وزاری کی آواز سن کر پڑوسیوں کو رحم آنے لگتا تھا۔ ان کا یہ بھی قول ہے کہ یہ روایت محفوظ ہے کہ انہوں نے جس مقام پر وفات پائی وہاں سات ہزار کلام مجید ختم کئے ہیں۔ ابو الجویریہ کا قول ہے کہ میں ابو حنیفہ رح کی صحبت میں رہا ہوں میں اس جماعت میں کسی کو ابو حنیفہ رح سے بہتر شب گذار نہیں پایا۔ میں مہینوں ان کی صحبت میں رہا۔ اس تمام زمانہ میں ایک رات بھی پہلو لگاتے نہیں دیکھا۔ مسعر بن کدام کا قول ہے کہ میں ایک رات مسجد میں داخل ہوا تو کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز کان میں آئی جس کی شیرینی دل میں اتر گئی۔ جب ایک منزل ختم ہوئی تو مجھ کو خیال ہوا کہ اب رکوع کریں گے۔ انہوں نے ایک تہائی قرآن پڑھ لیا۔ نصف ختم کیا اسی طرح پڑھتے رہے کہ کلام مجید ایک رکعت میں ختم ہو گیا میں نے دیکھا تو وہ ابو حنیفہ رح تھے۔ خارجہ ابن مصعب کہتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں چار اماموں نے پورا قرآن پڑھا ہے۔ عثمان بن عفان، تمیم داری، سعید بن جبیر اور ابو حنیفہ رح زائدہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں ابو حنیفہ رح کے ساتھ عشاء کی نماز مسجد میں پڑھی۔ آدھی نماز پڑھ کر چلے گئے۔ ابو حنیفہ رح کو معلوم ہوا کہ میں مسجد میں ہوں۔ حالانکہ تنہائی میں ایک مسئلہ میں پوچھنا

چاہتا تھا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر نماز میں قرآن پڑھنا شروع کیا۔ سہل ابن مزاحم کا قول ہے کہ دنیا ابو حنیفہؒ کے قدموں پر گری۔ انہوں نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا اس کے سینہ پر کوڑوں کے ذریعہ سے مجبور کئے گئے مگر قبول نہ کیا دو مرتبہ ابو حنیفہؒ نے حق کی حفاظت پر جسمانی تکلیفیں برداشت کی۔ اول مرتبہ بنو امیہ کے زمانہ میں جب ابن ہبیرہ عامل کوفہ نے کوفہ کی قضاء کا عہدہ قبول کرنے پر ان سے اصرار کیا انکار پر سو کوڑے لگوائے بالآخر چھوڑ دیا ہر روز دس کوڑے مارے گئے۔

ایک دن کوڑے لگنے کے دوران روئے چھوٹنے کے بعد رونے کا سبب کسی نے پوچھا تو کہا کہ مجھ کو اپنی والدہ کے صدمہ کا خیال آیا جو کوڑوں سے زیادہ ایذا رساں تھا۔ اس پر رو دیا۔ احمد بن حنبل اپنی مصیبت کے بعد جب ابو حنیفہ کی مصیبت کا ذکر کرتے روتے اور ان کے لئے رحمت کی دعا کرتے۔ دوسری مرتبہ خلیفہ منصور نے اس عہدہ کے قبول کے لئے بغداد بلایا اور اصرار کیا ابو حنیفہؒ انکار کرتے رہے۔ خلیفہ نے قسم کھا کر کہا کہ کرنا ہوگا انہوں نے انکار پر قسم کھائی یہ بھی مکرر ہوا۔ حاجب ربیع نے موقع پا کر کہا کہ ابو حنیفہؒ امیر المومنین بار بار قسم کھاتے ہیں پھر بھی تم انکار کئے جاتے ہو۔ جواب دیا امیر المومنین کو قسم کا کفارہ دے دینا مجھ سے زیادہ آسان ہے۔ بالآخر منصور نے قید کا حکم دے دیا۔ دوران قید میں ایک دن بلا کر پھر فرمائش کی۔ انہوں نے کہا اصلح اللہ امیر المومنین ما انا اصلح للقضاء

عبد اللہ بن مبارک کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے میری مدد ابو حنیفہؒ اور سفیان کے ذریعہ سے نہ کی ہوتی تو میں عام آدمیوں کی طرح ہوتا۔ عبد اللہ بن مبارکؒ سفیان ثوری سے کہا اے ابو عبد اللہ یا ابو حنیفہؒ غیبت سے کس قدر دور بھاگتے ہیں۔ میں نے کبھی ان کو کسی کی غیبت کرتے نہیں سنا یہ سن کر کہا واللہ ابو حنیفہؒ کی عقل اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ وہ اپنی نیکیوں پر ایسی بلا مسلط کریں جو ان کو فنا کر دے۔ علی بن عاصم کا قول ہے کہ اگر ابو حنیفہؒ کی عقل روئے زمین کے آدھے آدمیوں کی عقل سے تولی جائے تو اس کا پلّہ بھاری رہے گا۔ خارجہ بن مصعب نے ایک موقع پر ابو حنیفہؒ کے ذکر کے سلسلے میں کہا کہ میں نے ایک ہزار علماء دیکھے ہیں۔ ان میں سے تین یا چار عاقل پائے۔ ان میں سے ایک ابو حنیفہؒ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف شدید تھا۔ ایک رات امام نے عشاء کی نماز میں سورۂ اذا زلزلت پڑھی ابو حنیفہؒ جماعت میں تھے۔ جب نماز ختم کر کے آدمی چلے گئے تو میں نے دیکھا کہ ابو حنیفہؒ فکر میں غرق بیٹھے ہیں۔ تنفس جاری ہے میں دل میں کہا چپکے سے اٹھ چلو ان کے شغل میں خلل انداز نہ ہو۔ چنانچہ قندیل روشن چھوڑ کر میں چلا آیا اس میں تیل تھوڑا تھا۔ طلوع فجر کے وقت جب میں مسجد میں پھر آیا تو میں نے دیکھا کہ ابو حنیفہؒ اپنی ڈاڑھی پکڑے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ یا من یجزی بمثقال ذرۃ خیراً۔ میں اذان دی آ کر دیکھا تو قندیل روشن تھی اور وہ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر کہا کیا قندیل لینا چاہتے ہو۔ بالآخر رئیس اہل السنت نے سنہ ۱۵۰ھ میں بعمر (۷۰) سال بحالت سجدہ دنیا کو خیر باد کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علمائے امت دو قسم پر منحصر ہیں ایک حافظ حدیث ہیں جنہوں نے دین کے خزانوں کی حفاظت کی اور اس کے چشموں کو تکدر و تغیر سے پاک و صاف رکھا۔ انہیں کی کوششوں کا اثر تھا کہ جن لوگوں کی طرف اللہ پاک کی جانب سے بہتری بڑھی۔ وہ پاک چشموں پر وارد ہوئے۔ دوسری قسم فقہائے اسلام ہیں جن کے بقول مخلوق میں فتوی کا دار و مدار ہے۔ یہ گروہ استنباط احکام کے ساتھ مخصوص ہے۔ انہوں نے قواعد حلال و حرام کے انضباط کا اہتمام کیا وہ زمین پر آسمانوں کے تاروں کی مثال ہیں کہ ان کی وجہ سے تاریکی میں بھٹکنے والے ہدایت پاتے ہیں۔ کھانے پینے سے زیادہ انسان ان کے محتاج ہیں اور ان کی اطاعت نص کی رو سے ماں باپ سے زیادہ فرض ہے ایک روایت میں اولی الامر سے مراد علما ہیں دوسری میں امراء

مقبول جو ذرہ ہوا درگاہ میں رب کی ۞ وہ ملتفت نیر اعظم نہیں ہوتا

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

فن خطاطی کا ایک نمونہ

یہ طغریٰ حیدرآباد کے ایک خوشنویس محمد ضمیر الدین صاحب خدری نے تحریر کیا ہے۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلطان محی الدین صاحب
کامل نظامیہ

امام اعظمؒ کی شخصیت اور فقہ حنفی کی خصوصیات

امام ابوحنیفہؒ اپنے وقت کے امام اور مجتہد مطلق تھے۔ آپ کی شخصیت وعظمت کا اندازہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی طرز فکر سے ابتداء میں بہت اہل علم کو شدید اختلاف رائے رہا لیکن بالآخر سب ہی انصاف پسندوں نے آپ کے تفقہ، عمیق فکر و نظر اور عظمت علمی کو تسلیم کرلیا۔ صاحب الخیرات الحسان نے لکھا ہے:

"کسی شخصیت رفتہ کے تعلق سے لوگوں میں اختلاف رائے ہو تو یہ اس کے علو مرتبت کی دلیل ہے۔ حضرت علی رضؓ کی شخصیت ہی کو دیکھئے کہ ان کے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوئے۔ ایک تو محبت و مودت میں مبالغہ سے کام لینے والے اور دوسرے بغض وعناد کی وجہ سے آپ کی شان میں تفریط سے کام لینے والے۔"

بالکل یہی صورت حال امام اعظمؒ پر بھی صادق آتی ہے۔ ڈاکٹر ابوزہرہ پروفیسر فواد یونیورسٹی مصر نے بھی اپنی کتاب "حیات امام ابوحنیفہ" اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ:-

"امام ہمام کے تعلق سے صحیح ومعتدل رائے قائم کرنا آسان نہیں اس لئے کہ اصحاب مذہب نے اگر ان کی مدح وثناء میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا انہیں فقیہ و مجتہد کے مرتبہ سے بہت زیادہ بڑھادیا اور بعضوں نے نبی کے درجہ تک تو اس کے برخلاف ان پر نقد وجرح کرنے والوں نے اس قدر زیادتی اور شاتم ان کو یہ بھی خیال نہ آیا کہ شریعت و مذاہب کے نقطۂ نظر سے مسلمان کی ناموس وآبرو واجب الحفظ ہے۔ ان لوگوں نے نکتہ چینی کرنے میں نہ صرف اصول تنقید سے انحراف کیا بلکہ تنقید کے حدود سے بھی تجاوز کرگئے اور حقد وعناد کی فضا قائم کردی، ان لوگوں نے امام ابوحنیفہ کے عمیق افکار ونظریات کو جاننے اور سمجھنے کی زحمت ہی گوارہ نہ کی۔"

امام اوزاعی کو جو اپنے زمانے کے بڑے فقیہ سمجھے جاتے تھے۔ امام ہمام کے تعلق سے آغاز کار میں بدگمانی رہی عبداللہ بن مبارک سے کہدیا کہ "یہ کون بدعتی ہے جو کوفہ میں قیام پذیر ہے"۔ لیکن جب مکہ میں امام ابوحنیفہ سے آپ کی ملاقات ہوئی اور مسائل شرعیہ میں مباحث جاری رہے تو اس وقت امام اوزاعیؒ کو امام اعظمؒ کی علمی عظمت کا اندازہ ہوسکا اور ابن مبارک کے سامنے اعتراف کرنا پڑا کہ "مجھے تو ابوحنیفہ کے کثیر علم اور غزارت عقل پر رشک آتا ہے۔ خدا مجھے پناہ میں رکھے کہ میں غلطی پر تھا اور امام ابوحنیفہ کے تعلق سے جو باتیں میں نے سنی ہیں وہ ان سے بالکل مبرا ہیں۔ امام اعظمؒ کے تبحر علمی کمال درجہ کا تفقہ اور جلالت شان میں بے حساب معاصرین موافق و

مخالف سب ہی رطب اللسان ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بقول ابن مبارکؒ "وہ خلاصہ علم اور اس کا مغز تھے۔" جعفر بن ربیع فرماتے ہیں کہ پانچ سال تک آپ کی خدمت میں رہا۔ میں نے آپ سے زیادہ کم سخن کسی کو نہیں دیکھا، مگر جب فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو خوب کھل جاتے اور دریا کی طرح بہنے لگتے۔ آپ کے بعض معاصرین کا قول ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھے جو امام ابو حنیفہ سے زیادہ بہتر حدیث کو سمجھتے ہوں۔ فہم حدیث، تخریج اور استنباط احکام میں آپ نئے طریقہ و طرز جدید کے موجد ہیں اس لئے اختلاف کا ہونا ضروری ہوا۔ کیونکہ ہر نئی چیز کی ابتداء میں مخالفت ہی کی جاتی ہے۔ جب اس کی حقیقت و افادیت سمجھداروں کی سمجھ میں آجاتی ہے تو اختلاف کی خلیج بھی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آپ الفاظ حدیث سے احکام اور ان کے احکام و اسباب و علل و استنباط کرنے اور ظاہر معنی پر اکتفاء کرنے کی بجائے نصوص کے اصل منشاء و مفہوم کی تلاش فرماتے۔ استخراج علت کے بعد منصوص حکم کو اصل قرار دے کر اس کو نظائر و امثال کے لیے اساس قرار دیتے۔

طریقہ تخریج و استنباط

امام ہمام کا اصول استنباط جو انہیں کے الفاظ میں یہ ہے:-

"میں پہلے کتاب اللہ سے سند لیتا ہوں۔ اگر اس میں کوئی مسئلہ نہ مل سکے تو حدیث سے، اگر کتاب و سنت دونوں میں نہ ملے تو اقوال صحابہ سے اخذ کرتا ہوں اور ان اقوال و آثار میں جن کا قول چاہتا ہوں، لے لیتا ہوں اور جس قول کو چاہا ہو ترک کر دیتا ہوں۔ اور اقوال صحابہ کے مقابلہ میں کسی غیر صحابی کے قول کو نہیں لیتا۔ لیکن جب ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرینؒ، حسن، عطا، اور سعید بن مسیبؒ وغیرہ تک بات پہنچی تو وہ اجتہاد کرنے والے لوگ تھے، مجھے بھی ان کی طرح اجتہاد کرنے، غور و فکر کرنے کا حق و اختیار حاصل ہے۔ لہٰذا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں اور قیاس سے کام لیتا ہوں۔ اگر قیاس سے کام نہ چلے تو لوگوں کے معاملات اور فلاح و بہبود کا فیصلہ استحسان سے کرتا ہوں، اور جب اس سے بھی کام نہ چلے تو مسلمانوں کے عرف و تعامل کی طرف رجوع کرتا ہوں۔"

امام ہمام کے اس تفصیلی ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ جس کسی مسئلہ میں کتاب و سنت اور قول صحابی نہ ہو تو قیاس پر عمل کرنا چاہیے جبکہ قیاس مفید و سازگار ہو۔ اگر حکم قیاس موافق حالات نہ ہو تو استحسان سے استفادہ کیا جائے، اور اگر یہ بھی مفید حال نہ ہو تو تعامل اور عرف پر عمل کیا جائے۔

غرض کہ امام اعظمؒ نے اپنی فقہ کی تشکیل انہی سات اصولوں پر کی ہے:-

۱۔ کتاب اللہ ۲۔ سنت رسول اللہ ﷺ ۳۔ اقوال صحابہ ۴۔ اجماع ۵۔ قیاس فقہا ۶۔ استحسان ۷۔ تعامل و عرف عام۔

علامہ شہرستانی لکھتے ہیں کہ "عبادات اور معاملات میں بے حساب حوادث و واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر واقعہ اور پیش آمدہ مسئلہ کے بارے میں نص شرعی موجود نہیں اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ جب نصوص شرعیہ محدود ہیں اور واقعات غیر محدود۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ قیاس و اجتہاد کا اختیار کرنا نہایت ضروری اور یہ امر شرعی ہی ہے۔ تاکہ ہر نئے مسئلہ میں اجتہاد سے کام لیا جا سکے۔ اسی طرح علامہ ابن قیم نے بھی اعلام الموقعین میں لکھا ہے:-

"شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود پر ہے۔ اور شریعت سراسر حکمت، رحمت ہے

لہٰذا جس مسئلہ میں انصاف کی بجائے ظلم ہو، رحمت کی بجائے زحمت ہو۔ فائدے کی بجائے نقصان ہو اور عقل کی بجائے بے عقلی ہو۔ وہ آگے لکھتے ہیں :۔

"معاشرہ انسانی اور قانون کا باہمی رشتہ نہ جاننے کے باعث لوگوں میں ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور اسی غلط فہمی نے شریعت کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ جس شریعت میں مصالح انسانی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو اس میں ان تنگ نظروں کی کہاں گنجائش ہے۔"

اس وضاحت کا منشا یہ ہے کہ امام اعظمؒ نے پہلے ہی انہی مصالح اور حکمتوں اور وقتی تقاضوں کی اساس پر فقہ اسلامی کی تشکیل کی ہے۔ آپ نے تدوین فقہ کا اساسی اصول حریت فکر، تیسیر رکھا ہے جو خود کتاب اللہ کے اساسی اصول ہیں۔ نزول قرآن کا بنیادی مقصد اصلاح نفوس، انسانی صلاح و فلاح و بہبود ہے۔

قرآن حکیم کا پیغام ہے :۔

۱۔ یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ۔

وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتا ہے۔

۲۔ ویضع عنھم إصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔

وہ ان سے اس بوجھ اور ان بیڑیوں و جکڑبندیوں کو اتار پھینکتا ہے جو ان پر تھیں۔

۳۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔

اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی فراہم کرنا چاہتا ہے، وہ تو تمہارے لئے تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔

۴۔ یرید اللہ أن یخفف عنکم وخلق الانسان ضعیفاً۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہلکا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

۵۔ ماجعل علیکم فی الدین من حرج

اللہ تعالیٰ تم پر دین میں کوئی حرج و تکلیف نہیں رکھا ہے۔

اور خود شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ بعثت بالحنفیۃ السمحۃ البیضاء

مجھے تو ایک آسان اور روشن دین دے کر بھیجا گیا ہے۔

۲۔ بعثتم میسرین لا معسرین۔ تم لوگوں کو دوسروں کے لئے آسانی فراہم کرنے والے بنا کر بھیجا گیا ہے نہ کہ دوسروں کے لئے تنگی پیدا کرنے والے۔

۳۔ ماخیر بین أمرین اختار أیسرھما مالم یکن إثما۔ دو چیزوں میں سے آسان چیز کو اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ بشرطیکہ وہ شئی مختار از قسم گناہ نہ ہو۔

۴۔ ان اعظم المسلمین جرما من سأل عن شئی لم یحرم علی المسلمین فحرم علیھم من اجل مسئلتہ۔ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جو ایسی چیز سے متعلق جو مسلمانوں پر حرام نہیں کی گئی تھی لیکن اس کے سوال کرنے کی وجہ سے حرام کر دی گئی۔

۵۔ إن اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحد حدوداً فلا تعتدوھا وحرم أشیاء فلا تنتھکوھا وسکت عن أشیاء رحمۃ لکم من غیر نسیان فلا تبحثوا عنھا۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم پر چند فرائض عاید کئے ہیں،

ان کو ضائع مت کرو اور چند حدود مقرر کئے ہیں ان سے تجاوز
نہ کرو، اور چند چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کی پردہ دری
مت کرو۔ اور تم پر ترس کھاتے ہوئے بلا کسی بھول کے
چند امور میں سکوت اختیار فرمایا ہے تو تم ان امور میں بحث
و تکرار میں مت پڑو۔

خصوصیات فقہ حنفی

۱۔ ان تمام نصوص و آثار سے یہ واضح ہوا کہ امام ابو حنیفہؒ
نے شریعت کے "اصول یُسر" کو ترجیح دی اور اسی پر احکام
کی تخریج عمل میں لائی۔ اور فروع کی تفصیل بیان فرمادی۔

۲۔ فقہ حنفی کا دوسرا اصول نصوص شرعیہ کا مصالح اور
اسرار پر مبنی ہوتا ہے۔

احکام شرعیہ کو جاننے اور عمل کرنے میں دو مکاتب فکر
سامنے آتے ہیں۔ ایک طبقہ کی رائے ہے کہ جملہ احکام شرعیہ
تعبدی ہیں ان کے پیچھے کوئی حکمت و مصلحت پوشیدہ نہیں
ہیں۔ یعنی شراب خواری، چوری اور زنا وغیرہ اس لئے ناپسندیدہ
ہیں کہ شارع نے انہیں منع کیا ہے اور نماز و زکوٰۃ اس لئے
پسندیدہ ہیں کہ شارع نے ان کے کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔
فی نفسہٖ اعمال اچھے یا بُرے میں ان کو جاننے اور سمجھنے کی
ضرورت نہیں۔ امام شافعی کا رجحان اسی طرف ہے اور
شافعی علم کلام کی بنیاد بھی اسی پر قائم ہے۔ دوسرے مکتب فکر
کی رائے یہ ہے کہ تمام احکام مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہیں۔
"قول الحکیم لا یخلو من الحکمۃ۔ چنانچہ خود قرآن مجید
میں نماز کے تعلق سے کہا گیا کہ "ان الصلوٰۃ تنھی
عن الفحشاء والمنکر اور جہاد کے متعلق ارشاد ہے
حتی لا تکون فتنہ امام ابو حنیفہ اس دوسرے مکتب فکر
کے قائد اور امام ہیں۔ امام طحاوی جو محدث و مجتہد دونوں
حیثیتوں کے حامل ہیں، فرماتے ہیں:۔

"مسائل فقہ کو نصوص اور طریق فکر سے
ثابت کیا جانا چاہیئے۔ امام اعظمؒ کا مسلک
نصوص (احادیث) اور طریق فکر کے مطابق ہے"

۳۔ فقہ حنفی کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معاملات سے
متعلق جو اصول مقرر کئے گئے ہیں، وہ بڑے وسیع اور ترقی
وتمدن کے مطابق ہیں۔

۴۔ فقہ حنفی کی چوتھی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذمیوں
کے حقوق میں انصاف پسندی اور فراخدلی کا اصول ملحوظ
رکھا گیا ہے۔ اگر ایک مسلمان کسی ذمی کو قتل عمد کرتا ہے تو اس
سے قصاص لیا جاتا ہے۔ اور اگر قتل خطا ہوئی ہے تو اسی طرح
تاوان عاید کیا جاتا ہے۔

فقہ حنفی کی بنیاد نصوص شرعیہ، قیاس اور عرف و عادت
پر مبنی ہے جو بدلے ہوئے حالات میں انسانی فلاح و صلاح
کی طرف گامزن کرتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ امام اعظمؒ کی
فکر رسا بہت بلند تھی۔ وہ شریعت کے تقاضوں اور اس کے
مطالبات سے خوب آگاہ اور دور رس تھے۔ بلاشبہ بعض معاصر
اہل علم نے آپ کی طرز فکر اور طریقہ اجتہاد سے اختلاف
کیا ہے۔ اور آپ کو قیاس اور امام اہل الرائے کے خطاب سے
نوازا ہے۔ یہ دونوں چیزیں در اصل طعن کی نہیں ہیں۔
قیاس و رائے کا سلسلہ تو عہد رسالت ہی سے ہے۔ اور حقیقت
تو یہ ہے کہ آپکی فکر حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
سے ماخوذ و مستفاد ہے ۔ اور امام ابو حنیفہؒ اکثر یہ فرمایا
کرتے تھے:۔ "اللھم من ضاق بنا صدرہ فان قلوبنا
قد اتسعت لہ۔"

محمد عبدالمجید کامل نظامی المروری - ایم - اے (عثمانیہ)
استاذ جامعہ نظامیہ

علم ایک نور ہے اور اللہ تعالیٰ نور کو قلب انسانی میں فرشتوں کے ذریعہ ڈالتے ہیں اور حدیث شریف میں ہے "لا تدخل الملٰئکۃ بیتا فیہ کلب" یعنی فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو۔ قلب ایک گھر ہے اور اخلاق ذمیمہ جیسے حسد، کینہ، بغض، غضب، شہوۃ یہ کتا ہیں۔ لہذا طالب علم کیلئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے ظاہر کے ساتھ ساتھ قلب بھی پاک ہو۔ مشرکین کے اجسام اور کپڑے پاک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا انما المشرکون نجس کہ مشرکین ناپاک ہیں جسطرح اعضاء، جوارح کی عبادت نماز بغیر طہارت یعنی وضو کے نہیں ہوتی اسی طرح قلب کی عبادت علم بھی بغیر طہارۃ کے نہیں ہوتی۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں لیس العلم بکثرۃ الروایات انما العلم نور یقذف فی القلب یعنی علم کثرت روایات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک نور ہے جو قلب میں ڈالا جاتا ہے۔ اخلاق ذمیمہ ایک زہر ہے اور جاننے والا زہر کو استعمال نہیں کرتا۔ بہت سارے اخلاق ذمیمہ رکھنے کے باوجود اہل علم کہلائے جاتے ہیں مگر وہ ان علماء ربانیین میں نہیں آسکتے جنکے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انما یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ یعنی اللہ سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ طالب علم کو دنیا سے تعلقات کم کرنا چاہئے، دوستوں کو کم کرنا چاہئے۔ اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور رہنا چاہئے غالباً اسیلئے کہا گیا کہ العلم لا یعطیك بعضه حتی تعطیه کلك یعنی علم اپنا تھوڑا سا حصہ تم کو اس وقت تک نہیں دیتا جب تک کہ آپ اس کو اپنا کل نہ دے دیں۔ ان دو چیزوں کے بعد طالب علم کو یہ ضروری ہے کہ اپنے علم پر گھمنڈ اور تکبر نہ کرے۔ اپنے معاملہ کو پوری طرح استاذ کے ذمہ کردے، استاذ پر اپنا حکم یا جبر نہ چلائے اور استاذ کی نصیحت پر ایسا یقین رکھے جیسا کہ مریض اپنے طبیب حاذق کی نصیحت پر یقین رکھتا ہے، استاذ کی خدمت کو اپنی سعادت اور شرف سمجھے۔

شعبیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ زید بن ثابتؓ نے ایک جنازہ کی نماز پڑھائی، اسکے بعد سواری کے لئے ان کا خچر لایا گیا تو حضرت ابن عباسؓ نے خچر کے رکاب کو تھام لیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا خلّ عنہ، اس کو چھوڑ دو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا علماء اور کبراء کے ساتھ یہی معاملہ کرنے کا

ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضؓ نے ان کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور فرمایا اہل بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ سرکار دو عالم صلعم نے فرمایا لیس من اخلاق المومن التملق الافی طلب العلم یعنی چاپلوسی کرنا مومن کے اخلاق نہیں ہیں مگر طالب علم میں چاپلوسی درست ہے، غیر معروف اساتذہ سے علم حاصل کرنے سے انکار نہ کرے کیونکہ علم نجات کا ذریعہ ہے اور جو شخص کسی درندہ جانور سے نجات چاہتا ہے وہ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ نجات دلانے والا معروف ہے یا غیر معروف، علاوہ ازیں حضور اکرم صلعم نے فرمایا کہ الحکمۃ ضالۃ المومن لیغتنمھا حیث لیظفر بھا یعنی حکمت تو مومن کی گم شدہ شے ہے، جہاں کہیں مل جائے اس کو غنیمت سمجھتا ہے۔ طالب علم کا دل نرم زمین کی طرح ہو تاکہ استاذ کی ہر نصیحت کو قبول کر سکے ہماری آگہی کی خاطر اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر اور موسیٰ علیہما السلام کا قصہ ذکر فرمایا، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا "انک لن تستطیع معی صبرا" کہ آپ میرے ساتھ نہیں رہ سکتے اور آگے فرماتے ہیں۔ وکیف تصبر بما لم تحط بہ خبرا یعنی آپ اس پر صبر کیا کریں گے جس کا آپ کو علم نہ ہو اور اسکے بعد تو خضر علیہ السلام نے سکوت اور تسلیم کی شرط لگائی اور فرمایا کہ فان اتبعتنی فلا تسئلنی عن شئی حتی احدث لک منہ ذکرا یعنی اگر آپ میرے ساتھ ہو جائیں تو مجھ سے کسی بھی چیز کے متعلق نہیں پوچھنا تا انکہ میں خود اس کا ذکر آپ سے نہ کروں، مگر معلم جس چیز کے پوچھنے کی اجازت لو چھنا چاہیے۔ ارشاد باری ہے فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون کہ اگر تم کو معلوم نہیں ہے تو اہل علم سے پوچھو۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ طالب علم لوگوں کے اختلافات سے دور رہنا چاہیے کیونکہ اسکی وجہ سے اس کا ذہن پریشان ہو جاتا ہے، پہلے صحیح طریقہ سے اپنے مسلک مختار کو استاذ کے پاس سیکھ لیا جائے، اسکے بعد اختلافات اور شبہات کو دیکھنا چاہیے۔

جتنے علوم اور فنون اچھے ہیں ان کے متعلق معلوم رکھے کیونکہ علوم آپس میں ملے ہوئے ہیں اور یہ مسلم ہے کہ الناس اعداء لما جھلوا، کہ لوگ جس کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ پہلے ایک علم کو اچھی طرح پڑھ لیا جائے پھر دوسرا علم شروع کیا جائے۔ چنانچہ اشارہ باری ہے۔ یتلونہ حق تلاوتہ، کہ کتاب کو جیسا پڑھنا چاہیے ویسا پڑھتے ہیں۔ باب العلم رضؓ فرماتے ہیں" لا تعرف الحق بالرجال عرف الحق تعرف اھلہ کہ تم حق کو رجال سے نہیں پہچان سکتے، پہلے حق کو پہچان لیجئے پھر آپ خود بخود اہل حق کو پہچان سکتے ہیں۔

کسی بھی علم کا شرف اسکے نتیجہ اور ثمرہ سے کیا جاتا ہے علوم دنیا کا نتیجہ اور ثمرہ حیاۃ فانی ہے اور علوم الٰہیہ کا ثمرہ حیاۃ ابدی کی فلاح ہے۔ لہذا علوم الٰہیہ اور وہ علوم جو ان تک پہنچاتے ہیں وہ اشرف علوم ہیں۔ لہذا طالب علم کو اشرف علم کی طرف ہی راغب ہونا چاہیے، علوم الٰہیہ کا مقصد عہدہ، دولت یا دوستوں پر فوقیت نہ ہو، بلکہ قرب الٰہی ہو۔

علماء نے لکھا ہے کہ انسان جو کچھ علم سیکھے اس پر عمل کرنا چاہئے، حدیث شریف میں ہے کہ من عمل بما علم اعطاہ اللہ علم ما لم یعلم یعنے جسنے اپنے علم پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اس کو اب علم عنایت فرمائیں گے جسکو وہ نہیں جانتے۔

ادارہ

اقوال عارفانہ

- نماز اور روزہ بزرگ ہے لیکن کبر و حسد کو دل سے نکال ڈالنا زیادہ بزرگ ہے۔
- خدا کی دوستی اس دل میں قرار نہیں رہتی جس کو اسکے خلق پر شفقت نہیں ہوتی۔
- اگر دل کو علم و حکمت اور مشائخوں کی باتوں سے روک لیں تو دل مردہ ہو جاتا ہے۔
- تیری زبان تیرے دل کا ترجمہ کرنے والی ہے۔ تیرا چہرہ تیرے دل کا آئینہ ہے۔ چہرے پر وہی ظاہر ہوتا ہے جو کچھ دل میں پوشیدہ رکھتا ہے۔
- جو حق تعالیٰ کے سوا اور کسی سے انس و محبت رکھتا ہے اس کے انس کا حال خدا کے ساتھ ضعیف و بے اعتبار ہے۔
- بہتر حال آدمی کا وہ ہے کہ نفس عاجز ہو خلق کی طرف سے توجہ اٹھی ہوئی ہو۔ جملہ کاروبار میں خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم پر نظر ہو۔
- نیک اعمال تو نیک و بد دونوں قسم کے اشخاص کر لیتے ہیں لیکن معاصی سے اجتناب کرنا صدیق کا خاص شیوہ ہے۔
- کوئی شخص اپنے عیبوں پر نظر نہیں کرتا نیکیوں پر نظر کرتا ہے نفس کی شرارتوں پر وہ شخص نظر کرتا ہے جو ہر حال میں اپنے آپ کو برا خیال کر کے ملامت کرتا ہے۔
- جو چیزیں خدا تعالیٰ سے دور کرنے والی ہیں اس سے دور رہنا تقویٰ ہے۔ خدا کی عبادت سے نفس کو عبادت کے ثواب کے خیال سے روکنا ریاضت ہے۔
- جس چیز پر قابو نہیں ہے اسکا طلب نہ کرنا۔ اور جس چیز پر قابو ہے اس سے بے پروا رہنا قناعت ہے۔
- جو اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھتا ہے وہ متکبر ہے۔
- نرم جامہ و مزے دار کھانے کی عادت مت ڈالو کل کو اس لباس اور کھانے کی لذت سے محروم رہو گے۔
- اول مقام عبودیت اپنے اختیار سے خالی ہونا اور اپنی قدرت و قوت سے بیزار ہونا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حبیب محمد الحسینی صاحب
استاذ جامعہ نظامیہ

قرآن کی ہمہ گیری

اسلام کی مسلمہ و متفقہ کتاب قرآن مجید ہے جو اللہ تعالے نے مسلمانوں کو عطا فرمائی، یہی نہیں بلکہ قرآن مجید، روحانی اور جسمانی، دینی اور دنیاوی مشکلات سے نجات دلانے والے صحیفہ رحمت ہے قرآن مجید عموماً ہر ایک انسان کے لئے خصوصاً ہر ایک مسلمان کے لئے بہترین رہنما، اور وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات اور مجموعہ قوانین فطرت ہے اور ہماری مشکلات ومصائب کا حل اس میں بتلایا گیا ہے ۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ بالکل سچا اور سچا دعویٰ ہے کہ وہ قوانینِ فطرت اور کتابِ حکمت ہے جو انسانی زندگی کی فلاح وبہبودی کے لئے ضامن اور رہبرِ اعظم ہے اور وہی دینی اور دنیاوی ہدایتوں کا مخزن اور سرچشمہ ہے ۔ اللہ تعالے ارشاد فرماتے ہیں ۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔ یہ مبارک کتاب اس لئے اتاری گئی ہے کہ دانشمند لوگ اس کی آیتوں پر غور وفکر کریں ۔

پ ۲۳ سورہ ص ع ۳

یہ یاد رہے کہ قرآن مجید نے نازل ہوتے ہی اس عالم میں ایک ہل چل مچادی اور انسانوں کے لئے اخلاق، تہذیب وتمدن کے نئے نئے راستے تعمیر کر دئیے اس نے انسانوں کو گمراہی کے اندھیرے سے نکال کر نورِ ہدایت کی طرح رہبری کردی "

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

قرآن میں کیا ہے؟

قرآن مجید میں جو احکام ہیں وہ صاف وصریح ہیں کسی قسم کا اشتباہ نہیں یہی نہیں اس میں اوامر ونواہی ہیں جو بالکل واضح ہیں، قصص وحکایات انبیاء سابق ہیں جو بالکل صاف ہیں اصول معاشرت اور رہبنیت ہیں جن میں کسی طرح کا ابہام نہیں، مبداء ومعاد کا ذکر ہے جو بالکل صاف ہے ۔

قرآن پاک دراصل ایک ہدایت کی کتاب ہے اور ایک ایسی زبان میں ہے کہ عوام الناس کی سمجھ میں آسکے ۔ اس کا فلسفہ بھی ایسا فلسفہ ہے کہ عوام وخاص دونوں کی تشفی کرتا ہے عوام کو پیچیدگی مضامین سے نہ تو وقت میں ڈالتا ہے اور نہ خواص کو مضمون کی تشنگی سے بیاسا رکھتا ہے ۔ (انسکلوپیڈیا، آئینۂ عبرت پر تبصرہ)

آپ تمام قرآن کو دیکھ ڈالئے، ایک ایک لفظ کی چھان بین کر لیجئے ہر جگہ تعلیم کی یہی خوبی، درس کا یہی احاطہ کامل اور تہذیب عمل کی یہی ہمہ گیری نظر آئے گی ۔ عبادت کی تعلیم، صلاح تقویٰ کا درس، غور وتامل کی ہدایت، تفکر وتدبر کی تاکید ۔ الغرض ہر ارشاد اسی ایک اصولی ترقی پر مختصر ہے اور کسی جگہ بے معنی طاعت کو مقصود قرار نہیں دیا گیا نماز میں بھی اسی وحدت عمل کا نظارہ ہے، روزہ میں بھی اسی احساس انسانیت کی تعلیم ہے زکوٰۃ میں

بھی وہی تعاون اور ہمدردی کا سبق ہے۔ حج میں بھی
وہی وحدتِ عمل مقصود ہے۔ اور جہادِ نفس و مال محنت
وجفاکشی اور ایثار و قربانی کی تعلیم ہے جو اساس ارتقا اور
بنیان اخلاق ہے (مذہب صفحہ ۸۰)

قرآن کی ہمہ گیری

قرآن مجید جزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب
ہے۔ یہ کتاب لاکھوں انسانوں کے سینوں میں محفوظ ہے اور
آج ساری دنیا کے مسلمان اس طرح قرآن مجید کی تلاوت
کرتے ہیں جس انداز میں تیرہ سو سال قبل اہل قریش کیا کرتے
تھے۔ اسلام کی تعلیم ایک عالمگیر تعلیم ہے یہ ان لوگوں کی بھی
رہنمائی کرتی ہے جو اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور ان کو بھی
راستہ دکھاتی ہے جو اسلام کے منکر اور مخالف ہیں چنانچہ
آج دنیا کی مختلف قوموں میں بھی جتنی بھی اچھی باتیں پائی جاتی
ہیں وہ اسلامی دستور یعنی قرآن کی تعلیمات سے بالارادہ
یا بلاارادہ ماخوذ ہیں۔ وحدانیت کی جانب غیر مسلم اقوام کا
رجحان، مساواتِ انسانی کی تحریک سے دلچسپی، جمہوری اصلاحات
اور تمدنی خوبیاں یہ سب کچھ قرآن ہی سے دیگر اقوام نے
مستعار لی ہے۔ یہاں تک کہ زمانہ حاضرہ کی اکثر و بیشتر حکومتوں
کے اصلاحی قوانین بھی قرآن ہی کی روشنی میں ترتیب پائے
ہیں۔ (دین دنیا دہلی جلد ۳۴)

قرآن کریم مخالف لوگوں کو آج بھی چیلنج دیتا ہے
اور اسی جواب کو دہراتا ہے کہ جو اس نے مشرکین عرب
کو دیا تھا وہ یہ کہ اگر ساری دنیا کی طاغوتی طاقتیں اپنے
تمام علوم و فنون کا زور ختم کر دیں، تب بھی ایسی پوری
کتاب تو کیا اس کتاب کی ایک چھوٹی سی چھوٹی سورۃ
بھی نہیں بنا سکتیں۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا
عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ۔" اپنے
عجز کا اقرار فن بلاغت کے ماہر عربوں نے پہلے بھی کیا
اُس وقت سے آج تک بہت سے مخالفین برابر
کرتے آئے ہیں۔

قرآن مجید کے مشہور مترجم "جارج سیل"
(george sale) قرآن کے متعلق ذیل کے
الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔
"قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا
یہ مستقل معجزہ ہے جو مردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ
سے بلند تر ہے" (تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام صفحہ ۵)

قرآن کا اسلوبِ بیان

دنیا میں کلام کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں، نظم و نثر۔ نزول
قرآن حکیم کے وقت انہیں دو قسموں کا رواج تھا اور
ان میں عرب کو وہ کمال اور ید طولیٰ حاصل تھا کہ دنیا
کی کوئی قوم ان کا مدمقابل نہیں تھی۔ نظم و نثر کے تمام اصناف
پر ان کو ایسی مشق و قدرت حاصل تھی کہ کسی قوم کی نظم و نثر
کا چراغ ان کے سامنے جل نہیں سکتا تھا لیکن قرآن حکیم
کا طرز و اسلوب بیان نظم و نثر کے درمیان اور کلام کی ان
دونوں انواع سے ایسا ارفع و اعلیٰ ہے کہ نزول قرآن
کے بعد جب اہل عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان
فیض ترجمان سے کلام ربانی کو سنا تو وہ حیرت و تعجب
سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کلام ربانی کا یہ معجزہ
اور اسلوب بیان ان کی فہم و ادراک سے باہر تھا۔
علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے "اتقان القرآن فی علوم
القرآن" میں زرقانی کا قول نقل کیا ہے کہ "نزول
قرآن کے قبل اور اس کے عہد میں معمولی اور عادت کے

مطابق کلام کی کئی قسمیں رائج تھیں، مثلاً شعر، سجع، خطبے، رسائل
اور منشور کلام جس کے ذریعہ سے لوگ معمولی گفتگو کیا کرتے تھے اور
جو روزمرہ کی بول چال تھی مگر قرآن نے ان سب طریقوں سے
جدا اور خارج از عادات ایک نیا علیحدہ طریقہ پیش کیا، جس کا
درجہ خوبی میں ہر طریقے پر فائق ہے بلکہ وہ اس کلام موزوں سے بھی
خوبی میں بڑھا ہوا ہے جو عرب میں احسن الکلام مانا جاتا تھا۔
غرضکہ قرآنِ حکیم کا اسلوب بیان جو بالکل جدید اور اپنے حسن و
خوبی میں تمام اصناف نظم و نثر سے بڑھا ہوا ہے۔ (واعظ جلد ۳۵)

یہی سبب ہے کہ غیر متعصب اور سخت سے سخت متعصب
عیسائیوں کو بھی اس میں خوبیاں نظر آتی ہیں اور ان کو اسکا اعتراف
کرنا پڑتا ہے۔

مسٹر "جان ڈیون پورٹ" جو یورپ کے بڑے عالم ہیں
کہتے ہیں کہ "منجملہ ان بہت سی اعلیٰ درجے کی خوبیوں کے جو
واجب طور پر باعثِ فخر و ناز ہو سکتی ہے۔ وہ خوبیاں نہایت
بین ہیں یعنی اول تو اس کا وہ مودبانہ اور ہیبت و رعب سے
بھرا ہوا طرز بیان جو ہر ایک مقام پر جہاں اللہ کا ذکر یا اس ذات
کی طرف اشارہ ہے، اختیار کیا گیا ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کو
ان جذبات اور اخلاقی نقائص سے منسوب نہیں کیا گیا جو انسان
میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے کہ قرآن تمام خیالات اور قصوں سے
مبرا ہوتا ہے۔ جو فحش اور خلاف اخلاق اور نامہذب ہوں،
حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیوب توریت وغیرہ
کتب مقدسہ یہود میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت
قرآن ان سخت عیوب سے مبرا ہے۔ اس میں خفیف سی خفیف
ترمیم کی ضرورت نہیں۔ اول سے آخر تک پڑھ جاؤ اس میں
کوئی لفظ ایسا نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے کے چہرے پر شرم و
حیا کے آثار پیدا کرے۔" (ایضاً)

قرآن کی قوت تاثیر

کلام پاک میں ایسی قوت، تاثیر و دلکشی ہے۔ جو کسی انسان
کے کلام میں نہیں۔ مشرکین عرب جنھیں اپنے کلام و قصائد پر ناز تھا
وہ اپنے کلام و بیان کی تاثیر سے جادو کا کام لیتے تھے۔ کسی کی ہجو و
مذمت کر کے لوگوں کی نظر سے گرا دینا ان کا ادنیٰ کرشمہ تھا لیکن
جب کلام الٰہی کا معجزانہ تاثیر میں ڈوبا ہوا صوت سرمدی بلند
ہوا تو وہ سب اپنی سحر بیانی اور شعلہ فشانی بھول گئے اور اسکی
معجز بیانی پر مبہوت ہو گئے۔

علامہ سیوطیؒ نے "اتقان القرآن" میں تاثیر کلام ربانی
کی نسبت لکھا ہے کہ "قرآن کا اثر دلوں اور طبیعتوں پر گہرا
پڑتا ہے، تم قرآن کے سوا اور کسی منظوم یا منثور کلام کو سن کر دیکھو
ہر گز اس کے سننے سے یہ بات محسوس نہ ہو گی اسکے گوش زد ہوتے
ہی کان بالکل اس کی طرف متوجہ ہو جائیں اور قلب کو ایک طرح
کی حلاوت و لذت ملے اور کبھی دل پر ایک قسم کا رعب سما جائے
اور ہیبت طاری ہو جائے۔

کلام الٰہی اس قدر تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے کہ اگر یہ پہاڑ پر
نازل ہوتا تو وہ بھی خوف خدا سے پھٹ جاتا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ
خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔

(پ سورۃ الممتحنہ ع ۳)

اگر ہم یہ قرآن پہاڑ پر اتارتے تو آپ دیکھتے کہ پہاڑ خوف خدا
سے دہشت زدہ ہو کر پھٹ جاتا۔

تعلیمات و ہدایات قرآن حکیم

قرآن حکیم نے جن پاکیزہ و اعلیٰ عقائد
عقائد کی تعلیم دی ہے۔ ان سے انسان کی عقل و روح میں ایسی
روشنی پیدا ہوتی ہے کہ اسکی قوتِ ادراک دنیا و مافیہا سے

گذر کر عالمِ بالا کی سیر کرنے لگتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک نے جن
عبادات و اخلاق کی تعلیم دی ہے ان کی پابندی سے انسان
اس درجہ نیک اور مہذب بن جاتا ہے کہ دنیا و آخرت اسکے
لیے سرمایہ راحت بن جاتی ہے۔ قرآن کے اصول دنیا میں عدل
و انصاف کو قائم کرتے ہیں اور انسان کو امن و عافیت کی
زندگی بخشتے ہیں یوں تو دنیا میں بیسیوں مذاہب ہیں لیکن
قرآن پاک کی تعلیمات سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا
کہ یہ تعلیمات کس قدر کامل اور انسان کو دنیا و آخرت میں کس
قدر مفید ہیں۔ ہستی باری تعالیٰ کے عقیدے ہی کو لیجئے کہ
جس کی صحت پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے۔ دوسرے
مذاہب نے کس قدر غلطیاں کیں اور اس ذات پاک کے سمجھنے
میں دوسرے اہل مذاہب سے کس قدر لغزشیں ہوئیں۔ کسی نے
اینٹ پتھر وغیرہ کو خدا سمجھ لیا۔ تو کوئی بارش اور ہوا کی..
طاقتوں کو سجدہ کر کے متعدد معبودوں کا معتقد ہو گیا کسی نے
اُسے واحد سمجھا لیکن بہت سے جسمانی خواص بھی اس کیلئے تسلیم
کر لئے۔ کوئی ممتاز انسانوں کے جسم میں اس کے حلول کا
قائل ہوا اور اس کو جسمانی ضروریات میں مبتلا مان کر خاکی
انسان کی پرستش میں محو ہو گیا اور کسی نے دوسری ضروریات
سے پاک مانا لیکن باپ بیٹے کے رشتے کو فرض کر کے
انسان کو خدائی طاقتوں میں اس کا شریک ٹھیرایا۔ غرضکہ
قرآن حکیم نے جلوہ فرما ہو کر عقیدۂ ذات باری تعالیٰ کے
متعلق صحیح رہنمائی فرمائی۔ ملاحظہ ہو۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (سورہ بقرہ ع ۱۹)

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اور نہیں ہے
کوئی معبود بجز اُس کے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

اثباتِ توحید پر قرآن حکیم کی دلیل

قرآنِ حکیم نے خدا کے ایک ہونے پر یہ دلیل قائم فرمائی
کہ نظامِ عالم میں جو توافق اور انتظام کائنات میں جو باقاعدگی ہے
وہ خدا کے ایک ہونے کو ثابت کرتی ہے کیونکہ اگر ایک سے
زائد خدا ہوں تو یہ نظام و انتظام درہم برہم ہو جائیگا یعنی
اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس کارخانۂ عالم کو چلانے والی دو
ذاتیں ہیں تو اُن میں اختلاف پایا جانا ضرور ہے اور اس
اختلاف کا اثر نظام و انتظام عالم کو برباد کر دے گا جیسا
کہ ارشاد ہے:-

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ
اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (پ ع)

اگر زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے تو
ان کا نظام بگڑ جاتا۔

یعنے اگر متعدد خدا ہوں تو ان کے ارادے میں اختلاف
بھی لازم ہے۔ اب اگر ایک دوسرے کے ارادہ پر چلے تو
ایک غالب دوسرا مغلوب ہوگا۔ اور جو مغلوب ہوگا ظاہر
ہے کہ وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اگر دونوں کے ارادوں کا ظہور
اس عالم میں ہو تو نظامِ عالم درہم برہم ہو کر دنیا فنا ہو جائے۔
غرضکہ قرآنی تعلیمات و ہدایات ایسی ہیں کہ وہ دنیا
کی تمام اقوام اور دنیا کے تمام ممالک کے لیے قابلِ عمل ہیں
اور چاہے مشرق کی کوئی قوم ہو یا مغرب کی سب کیلئے
یکساں مفید ہیں۔ کیونکہ قرآن حکیم ایک ایسا مکمل و جامع
نظامِ اصلاح و ہدایت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے حالات و
طبائع سے بالکل موافق ہے۔ قرآنی تعلیمات سے ہر قوم راہ
ہدایت پر چل کر مطمئن ہو سکتی ہے۔

نعت شریف

جب سے نصیب اُس سے قدمِ مصطفےٰؐ ہوا
طیبہ کی ہر گلی میں ہے میلہ لگا ہوا

جب نُورِ حق حضورؐ میں جلوہ نما ہوا
شمس الضحیٰ ہوا، کہیں بدر الدجیٰ ہوا

کوئی ہوا کلیمؑ تو کوئی ہوا خلیلؑ
محبوب رب کا کوئی نہ اِن کے سوا ہوا

کیا جانے کیا ہو، گر ملے دامن رسولؐ کا
جب نام ہی رسولؐ کا مشکل کُشا ہوا

اچھا ہوا کہ شافعِ محشر حضورؐ ہیں
محشر میں عاصیوں کو بڑا آسرا ہوا

اللہ نے ختم کر دی بڑھائی سب آپؐ پر
اِس واسطے نہ آپؐ سے کوئی بڑا ہوا

سکتے میں آ کے وسعتِ کونین رہ گئی
غارِ حرا میں جب وہ رسولِ خدا ہوا

راھی زباں پر جب سے محمدؐ کا نام ہے
ہر مرحلہ ہے زیست کا آساں بنا ہوا

(ڈاکٹر راہی (بی اے، یم ایس)

نعت شریف

اتنی توفیق عطا اِسکو خدا دا لے کر
تری اُمت جیئے اب تیرا ہی سودا لے کر

رات آئی ہے ہو اللیل کا سودا لے کر
دن نکلتا ہے ہو الشمس کا جلوہ لے کر

دین اُن کا ہے خدا ان کا خدائی انکی
سانس لیتے ہیں جو نام شہ والا لے کر

من رانی کی صدا ذہنوں میں در آئی ہے
حق نے آواز دی شاید ترا لہجہ لے کر

ہم گنہگار ترے اُمتی کہلاتے ہیں
کچھ توجہ ادھر اے زلف دوتا والے کر

پاک رکھتا ہوں فقط ذکر نبی سے دل کو
حق سے ملتا ہے مجھے آئینہ اُن کا لے کر

تم پر جبریل امیں رشک خدائی لے کر
کاش [illegible] بڑھ جائے فقط ان کا وسیلہ [illegible]
اپنے قدموں سے مجھے دور نہ کیجیے آقا

دل سے مجبور ہوں میں درد تمنا لے کر
پرتوِ حسن نبی سے ہیں دو عالم روشن

برق کیا چیز ہے سب چمکے ہیں صدقہ لے کر
وہ ہیں موجود تری پشت پناہی کے لئے

اُنکو آواز دے ایمان کا جذبہ لے کر
دل میں عشق محمدؐ سے ہے سرشار جلیل

جھومتا ہوں میں فقط نام نبیؐ کا لے کر
(محمد جلیل احمد جلیل متعلم جامعہ نظامیہ)

(ادارہ)

ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے راستہ میں ایک چیونٹی پر آپ کا قدم پڑ گیا وہ زخمی ہوگئی اور درد کی وجہ سے ہاتھ پاؤں پٹک رہی تھی۔ اس کی تکلیف کا اثر آپکے قلب پر ہوا آپ اس قدر غمگین ہوئے کہ اس کے پاس بیٹھ کر رونے لگے، صدمے سے آپ بالکل نڈھال ہوگئے چیونٹی ہاتھ پاؤں مار کر بل میں چلی گئی لیکن آپ کے دل میں اس حادثہ اور صدمہ کا بہت ملال رہا۔ اسی شب میں آپنے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضور خشمگیں ہیں اور ڈانٹ رہے ہیں کہ اے علی تم نہیں سنتے کہ آج ساتوں آسمانوں میں تمہارے ظلم و ستم کی داستان گونج رہی ہے جس چیونٹی پر تم نے قدم رکھ دیا تھا وہ اپنے قوم کی سردار اور صدیقان بارگاہ میں سے تھی۔ وہ جس دن سے پیدا ہوئی پل کو بھی خدا کی تسبیح و تہلیل سے غافل نہ ہوئی، مگر اس وقت تم نے اسے کچل دیا۔

حضرتؐ کی بات سن کر آپ کانپ اٹھے اور فرمایا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب ہم کیا کریں اسکی تلافی کی اب کونسی صورت ممکن ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا اے علی گھبراؤ نہیں۔ اس چیونٹی نے خدا سے تمہاری معذرت چاہی ہے اور کہا ہے کہ اے پروردگار تو نے ہر کام میں قصداً اور بلا قصد کو معتبر فرمایا ہے علی سے یہ حرکت قصداً نہیں بلا قصد سرزد ہوئی ہے اس سے درگزر فرمائیں بخشائش چاہتی ہوں تو ان کو بخش دے۔

چونکہ میرے دربار کے شجاع کہلاتے ہو اسلئے چیونٹی نے شفاعت کی اور تمہاری رہائی کا احسان رکھا جب یہ قصور معاف ہوا۔ اے علی اگر وہ تمہاری سفارش نہ کرتی تو بارگاہ خداوندی میں تمہاری رسوائی ہوتی۔

(تقوی کے یہ معنی ہیں کہ ناچیز سے ناچیز مخلوق کی طرف بھی حقارت و توہین کی نظر نہ اٹھانی چاہیئے اگر راستے میں چیونٹی بھی آجائے تو بچا کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے)

ایک بار چور احمد خضرویہؒ کے گھر آیا بہت تلاش کے باوجود کچھ نہ پا سکا۔ جب ناامید ہو کر لوٹنے لگا تو احمد خضرویہؒ نے چور سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے جوان ایک ڈول پانی کھینچ لا اور وضو کرکے نماز میں مشغول ہو جا تاکہ مجھے جو فتوحات حاصل ہوں وہ تمہارے حوالے کردوں، خالی ہاتھ ہمارے گھر سے جانا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ اس نوجوان نے نصیحت پر عمل کیا۔ صبح کو جب آفتاب طلوع ہوا ایک شخص نے سو دینار حضرت کی خدمت میں پیش کئے شیخ نے اس جوان سے کہا سارے دینار اپنے قبضہ میں کرلو۔ یہ رقم ایک رات کی نماز کا صلہ ہے اس وقت اس نوجوان کے اندر عجیب کیفیت پیدا ہوگئی

اس کا بدن خوف سے لرزنے لگا اور رونا شروع کیا،
اور کہا افسوس میں ایسے خدا کی راہ سے بھٹکا ہوا ہوں
جو ایک رات کی عبادت کے عوض اتنا کرم فرما دے۔
پھر صدق دل سے توبہ کی خدا کی طرف رجوع ہوا مال و
زر کو قبول نہ کیا لیکن شیخ کے حلقۂ غلامی میں داخل ہو گیا۔

ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ مسجد میں نماز
ادا کرنے کی غرض سے تشریف لائے تو ایک توانا تندرست
آدمی نے مسجد کے اندر آکر سوال کرنا شروع کیا۔
حضرت جنید موجود تھے آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ
یہ شخص تندرست ہے محنت و مزدوری کر سکتا ہے
پھر بھی سوال کی ذلت و خواری کو اپنے اوپر کیوں گوارا
کرتا ہے رات کو آپ نے خواب میں دیکھا ایک طباق آپکے
سامنے رکھا گیا ہے اور کہا گیا کہ اس کو تناول فرمائیے۔
جب آپنے اس طباق سے سرپوش اٹھایا تو دیکھا کہ
وہ درویش مردہ رکھا ہوا ہے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا
کہ آدمی کو کیونکر کھا سکتا ہوں، آپ کو جواب ملا کہ تو اس کو
مسجد میں کیوں کھاتا تھا۔ حضرت جنیدؒ سمجھ گئے کہ میں نے
دل میں اس کی غیبت کی تھی یہ اسی کی گرفت ہے۔ آپ
خوف سے بیدار ہو گئے وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی اسکے بعد اس
درویش کی تلاش میں نکل گئے وہ درویش دجلہ ندی کے کنارے
بیٹھا پانی کی سطح پر بہتے ہوئے ساگ کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر
کھا رہا تھا یکبارگی اسنے آپکی طرف دیکھا اور کہنے لگا اے جنید
میرے متعلق تمہارے دل میں جو بدگمانی پیدا ہوئی تھی اس سے تم نے توبہ
کر لی یا نہیں آپنے جواب دیا ہاں۔ جاؤ آئندہ سے ہوشیار رہنا اور
اپنے دل کی نگہبانی کرتے رہنا بدگمانی برائی سے اپنے دل کو پاک و صاف رکھا کرو

— — — — — — — — —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہدیۂ تشکر

اخلاقیات کا فریضہ ہے کہ:
محسن کے احسان کا عمدہ بدلہ دیا جائے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ھل جزاء الاحسان الا الاحسان۔ کیا احسان کا بدلہ احسان نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے فاذکرونی اذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرو ناشکری نہ کرو۔ محسنِ انسانیت صلعم کا ارشاد ہے: مَن لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔

اس عظیم الشان سالنامہ کی اشاعت پر ہم اپنے محسنین و معاونین کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش نہ کریں تو یہ ہماری بداخلاقی ہی نہیں بلکہ خدا اور اسکے رسول صلعم کی نافرمانی بھی ہوگی۔ اَللّٰھُمَّ احفظنا۔

لہٰذا جمعیۃ الطلباء جامعہ نظامیہ کی جانب سے ان تمام محسنین و معاونین کی خدمت میں گلدستۂ ممنونیت پیش کرتا ہوں کہ جنھوں نے ہماری دامے، درمے، سخنے، قدمے ہر طرح اعانت کی خصوصاً مولانا قطب الدین حسینی صابری امیر جامعہ نظامیہ مجلس ادارت کے سرپرست مولانا مفتی عبدالحمید صاحب شیخ الجامعہ، مشیرِ اعلیٰ مولانا سلطان محی الدین صاحب رکن معزز، مشیر مولانا خواجہ شریف صاحب استاذ جامعہ، جنکی کامیاب رہنمائی اور مفید مشوروں کے سبب ہم **انوار نظامیہ** شائع کرنے کے قابل بن سکے۔

محترم جناب سید لطیف الدین قادری صاحب رکن معزز اور دیگر معزز اراکین مجلسِ انتظامی و اساتذہ کرام کے مالی تعاون سے سالنامہ کی اشاعت ممکن ہو سکی جس کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور محترم جناب قاری محمود احمد صاحب (شریف صاحب) تاجر اولڈ موٹر پارٹس کا بھی ممنون ہوں کہ جنھوں نے خصوصی طور پر مالی تعاون کیا۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

بارگاہ ربّ العزت میں دست دعا دراز کرتا ہوں کہ جس طرح سالنامہ **انوار نظامیہ**، اراکین مجلس، اساتذہ کرام اور جمعیۃ الطلبہ کی معاونت کے ذریعہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا اسی طرح جامعہ نظامیہ بھی سب کی کاوشوں کے ذریعہ دن دونی رات چوگنی ترقی کی منزلوں کو طے کرتا جائے اور وہ دن دور نہ رہے کہ یہ جامعہ، جامعہ ازہر ہند بن کر چہار دانگِ عالم میں اپنی کامیابیوں کے پرچم لہراتا رہے۔ ایں دعا از من و جملہ جہاں آمین آباد۔

خادم انوار نظامیہ
سید محمد عبداللہ قادری کرنولی
فاضل نظامیہ